Courtesy of www.pdfbooksfree.pk
گردش
PDFBOOKSFREE.PK
ڈاکٹر عبدالرّب بھٹّی
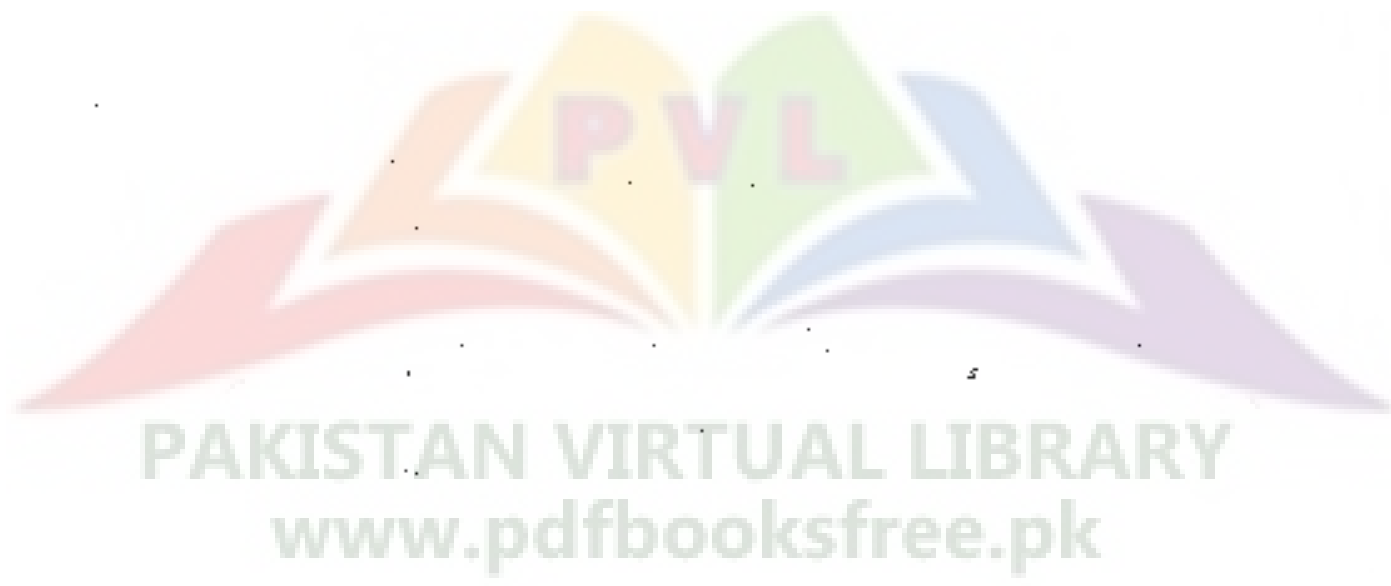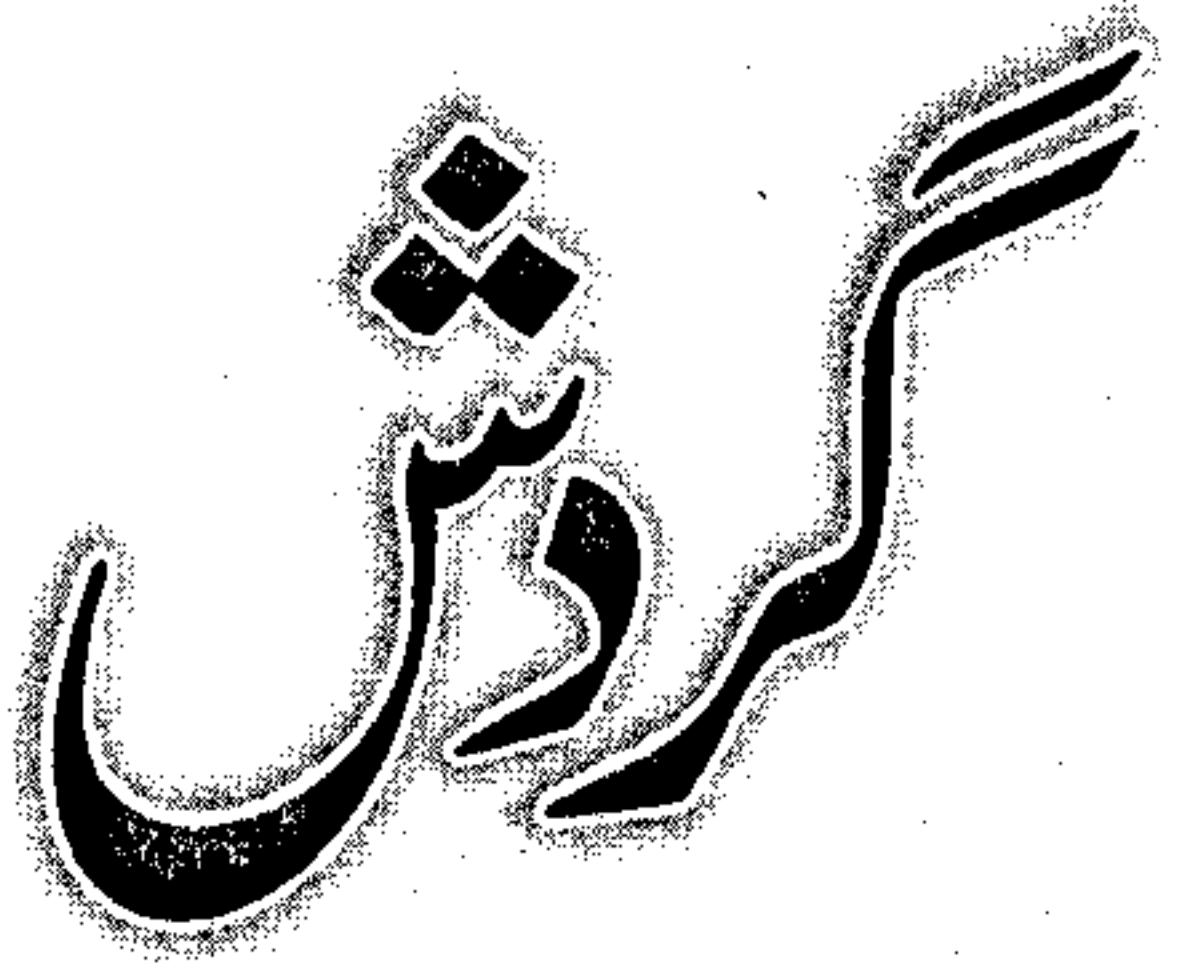
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

انتساب

مصائب اور پیاس بھری زندگی
کو مقدر میں پانے والے
تھر کے مکینوں کے نام
جن کی غلامی سے بدتر زندگی
"وڈیرا سائیں" کے رحم وکرم پر ہے

پیش لفظ

داستان گوئی ہو یا ناول نویسی۔۔۔۔۔ ہر دور میں طویل اور مختصر افسانوں اور کہانیوں کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ایک ہی نشست میں پڑھی جانے والی کہانی کا اپنا ایک الگ مزہ ہوتا ہے۔ایک کہانی کو تحریر کرنا گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنا ہے۔جس طرح چھوٹی چھوٹی مسرتوں میں ایک انوکھی خوشی کا لطف ہوتا ہے بالکل اسی طرح طویل اور مختصر کہانیوں کا ایک الگ ذائقہ ہوتا ہے۔

''گردش'' میرے ناولوں کے بعد۔۔۔۔ پہلا طویل اور مختصر کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے یکجا کرنے کا بیڑا محترم ناصر اقبال مجاہد صاحب نے اٹھایا ہے۔ جو خود بھی صرف ایک ناشر ہی نہیں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ حساس اور باشعور قاری ہیں۔

موصوف کو میری ایک مکمل کہانی ''دریا'' نے خاصا انسپائر کیا ہے انہوں نے میری دیگر چند تحریروں کو پڑھا اور مجھ سے فرمائش کر ڈالی کہ ''بھٹی صاحب! اخبارات اور ڈائجسٹوں میں چھپنے والی تحریروں کی تو کوئی زندگی نہیں ہوتی نہ یہ تحریریں زیادہ دیر تک منظر عام پر رہتی ہیں۔۔۔۔۔ لیکن کتاب تو عمر جاوداں کا درجہ رکھتی ہے، آپ ہمت کریں تاکہ اب تک آپ کے جتنے بھی مختصر اور طویل افسانے اور ناولٹ ہیں ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔''

سو یہ میرا پہلا مجموعہ قارئین کی نظر ہے وہی اس کی پسند اور ناپسند کا حق رکھتے ہیں ایک ادیب تو اپنی تحریروں سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا جس روز وہ اپنی تخلیق اور اپنی تحریر سے مطمئن ہو گیا اس کی وجدانی موت واقع ہو جائے گی اور تخلیق کا عمل رک جائے گا۔۔۔۔۔۔ اللہ حافظ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جیکب آباد (سندھ)

دریا

ساتھی تیار تھی۔۔۔

چاولوں کی کٹی ہوئی فصل کو سیمنٹ کے ایک بڑے سے پتھر پر پیٹا جا رہا تھا

اس عمل سے اناج ایک طرف اور پھونس کو مقدور بھر علیحدہ کیا جا رہا تھا۔ اطراف میں دور تک پھیلے ہوئے چاولوں کے اس کھیت میں متعدد خاکستری پیٹھوں والے مدقوق سے ہاری جن میں عورتیں اور جوان العمر لڑکیاں بھی شامل تھیں' ٹولیوں کی صورت' بڑی تندہی کے ساتھ جفاکشی میں مصروف تھیں۔ حالانکہ اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے والا تھا مگر جفاکشی سے ان محنت کشوں کے چہرے پسینے سے تربتر ہو رہے تھے اور ویسے اندرون سندھ کے دیہی علاقوں میں قیامت خیز گرمیاں مسلسل عذاب جاں بنی چمٹی رہتی تھیں اور مشکل سے ہی جان چھوڑتی تھیں۔ حتیٰ کہ اس وقت سورج بھی سروں پر مسلط آ گ

برساتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کھیتوں میں کام کرنے والے یہ سب لوگ گوٹھ کے ایک بااثر وڈیرے رئیس جابر خان کے دھاک (کھیت مزدور) تھے۔

مذکورہ گوٹھ وڈیرے رئیس جابر خان کے پردادا وسند خان کے نام سے موسوم تھا، جو دادو جانے والی انڈس ہائی وے سے تقریباً پندرہ سو کلومیٹر دور لاڑکانہ کے نواح میں واقع تھا۔ اس کے جنوبی قرب میں رائس کینال کا سبک روپانی چھوٹی چھوٹی کاریزوں کے ذریعے آس پاس کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ یہ گوٹھ تین چار سو نفوس پر مشتمل تھا جدھر بابا اللہ یار کی آٹا پیسنے کی چکی کے علاوہ ایک گورنمنٹ ڈسپنسری، پرائمری اسکول اور میڈیکل اسکول بھی تھا۔ آبادی کے وسط میں ایک مسجد بھی تھی۔

اس وقت کھیتوں میں کام کرنے والے ان جفاکش ہاریوں میں ایک غریب ہاری حسین بخش کا بھی خاندان تھا اور حسین بخش خود، اس کی بیوی مائی مختاراں اور جوان بیٹا محمد پنل بھی ساتھی میں مصروف تھے۔ یہ درحقیقت ایک تھری خاندان تھا اور ان کا تعلق تھر کے ایک ریگستان گوٹھ "منٹھی" سے تھا۔ وہاں آئے دن پڑنے والے قحط اور خشک سالی کی وجہ سے دیگر باشندوں کی طرح یہ بھی وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آن بسا تھا۔

ہاری حسین بخش کی اپنے پورے خاندان سمیت یہاں آباد ہونے کی ایک سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ یہاں "گوٹھ وسند خان" میں ایک عرصے سے اس کا بڑا بھائی سکھیو بھی اپنی بیوی عنایتاں اور بیٹے سرمد کے ساتھ رہتا تھا اور درحقیقت اپنے بڑے بھائی سکھیو کے ایما پر ہی حسین بخش نے اپنے پورے کنبے سمیت یہاں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ حسین بخش کی ایک سترہ سالہ جوان بیٹی سوہنی بھی تھی۔ وہ اپنے بھائی محمد پنل سے دو سال ہی چھوٹی تھی۔ عموماً وہ گھر پر ہی رہتی تھی۔ اپنی بھابھی ریشماں کے ساتھ۔۔۔ پنل سے اس کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے مگر ہنوز اس کی گود بلکہ فی

الوقت کوکھ تک خالی تھی۔

آغاز میں حسین بخش اپنے کنبے سمیت سکھیو کے دو تنگ و تاریک کوٹھری نما گھر میں ہی رہتا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے وڈیرے رئیس جابر خان سے اجازت لینے کے بعد ایک چھوٹے سے قطعہ زمین پر کچی اینٹوں پر گارے مٹی اور بھوسے کا لیپ کر کے اپنا الگ سے دو کمروں کا گھر بنالیا تھا۔ اس میں بھی سکھیو کی کوششوں اور محنت کا دخل تھا کیوں کہ اس نے اور اس کے بیٹے نے از خود تعمیر میں اس کا ہاتھ بٹھایا تھا۔ شہروں کے مقابلے میں دور افتادہ گوٹھوں کے مکانات بالکل سادہ اور آسان طرز تعمیر کا نمونہ ہوتے ہیں کہ خود ہی لوگ اپنی مدد آپ کے تحت کٹی' بھوسے اور مٹی کا گارا تیار کر کے، البتہ کچی اینٹیں ذرا خریدنا پڑتی ہیں جو گوٹھ کے بھٹے سے ادھار پر بھی مل جایا کرتی تھیں پھر دن رات ایک کر کے چار دیواری قائم کر دی جاتی اور سادہ سے کوٹھری نما کمرے ڈال دیے جاتے تھے۔ ان میں ضرورتاً مکینوں کے ساتھ چند ایک مزدور بھی شامل کر لیے جاتے تھے۔ باقی ماندہ چھوٹا موٹا ضروری سامان مثلاً دروازے اور کھڑکیوں کی چوکھٹ وغیرہ شہر سے خرید لیے جاتے تھے۔ ذریعہ معاش کا مسئلہ بھی سکھیو نے حسین بخش وڈیرے کی زمینوں کی دھا کی دلا کر حل کر ڈالا تھا۔

حسب دستور موسم کی فصل اترنے پر انہیں آدھا حصہ مل جایا کرتا تھا' جس میں یہ لوگ کچھ حصہ اپنے لیے محفوظ کر دیتے تھے اور بقیہ حصہ شہر کی منڈی میں لے جا کر "بھل ڑوں" کو فروخت کرآتے تھے۔ فصل کا آدھا حصہ تو بس نام تھا ورنہ ان بے چارے غریب ہاریوں کو آدھا بھی کب ملتا تھا۔ بیج' یوریا حتیٰ کہ ڈھل (ٹیکس) بھی ان ہاریوں کو ہی بھرنا پڑتا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ کمیشن کی صورت میں دو تین من اناج' وڈیرے جابر خان کا حریص منشی میرو پہلے ہی کاٹ لیتا تھا۔ کسی کی کیا مجال جو ذرا بھی صدائے احتجاج بلند کرتا۔ وہ جانتے تھے اس طرح انہیں نہ صرف مزدوری سے ہاتھ دھونے پڑتے بلکہ بے گھر بھی ہونا پڑتا مگر حسین بخش ہاری کے بیٹے پنل کو یہ

بات گراں گزرتی تھی۔لیکن وہ باپ کی تنبیہہ کی وجہ سے خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا
مگر اس بار جب فصل اچھی اتری تھی۔محمد پنل نے کہہ رکھا تھا کہ وہ منشی کو ایک بوری
سے زیادہ ہرگز نہیں دے گا۔یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے قریب ہی درانتی چلاتے باپ
کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا اس کے بعد وہ خود فصلوں کے بیچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور
اپنی اجرک سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے قریب ہی زمین پر بچھی رتی پر آن بیٹھا
یہاں صراحی رکھی تھی۔جست کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس سے پانی انڈیل کر پینے لگا
گلاس کے افق سے ایک ٹک مگر گھمبیر نظریں دور ایک منحنی سے شخص پر مرکوز تھیں۔اسے
دیکھ کر محمد پنل کی آنکھوں میں نفرت کے سائے لہرا گئے۔یہ منشی میرو تھا جو اس وقت
رجسٹر بغل میں دبائے اپنے چند مسلح حواریوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے والے
ہاریوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔اس کی گول گول عدسوں والی عینک کے عقب میں
حریصانہ چمک صاف عیاں تھی۔گلاس صراحی کے اوپر الٹا رکھ کر پنل دانت پیسنے لگا
اسے معلوم تھا کہ ان ہاریوں میں بے چارے وہ افراد بھی تھے جو وڈیرے کی نجی جیل
کے قیدی تھے۔ان کو خود ساختہ قرضوں اور سود در سود کی زنجیروں سے جکڑ رکھا تھا۔

اثنائے راہ اس کا باپ حسین بخش بھی آ گیا۔اس کے بدن پر صرف میلی
چیکٹ ''راک'' (تہبند) تھی۔

''پیو! اس بار ہم منشی کو صرف ایک بوری گندم دیں گے۔''

حسین بخش پانی پیتے پیتے چونک کر اپنے کڑیل بیٹے کے گرم جوش چہرے کو
تکنے لگا۔وہ اپنے بیٹے کی اس بات سے انجانا سا خوف محسوس کرنے لگا تھا۔

''ناں پت! ایسا مت بول۔منشی میرو بڑا کمینہ آدمی ہے۔'' وہ سرگوشی میں
دور کھڑے منشی میرو کی طرف دیکھ کر بیٹے سے بولا۔

''اس نے اگر وڈے سائیں سے شکایت کر دی تو اس سے بھی جائیں
گے۔''

''بابا! ہم محنت کرتے ہیں، ہم حق رکھتے ہیں کہ اپنی مرضی سے جو دیں وہ
اسے قبول کرنا ہے۔۔۔۔۔نا کہ ہمیں۔۔۔۔'' پنل نے قدرے جوش بھرے لہجے
میں کہا تو اس کا باپ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔

''دیکھ میرے بڑھاپے کا ہی خیال کر لے۔مت لگ اس مردود کے منہ مجھے
تو اب تیرے سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔'' باپ کی بات پر ہمیشہ کی طرح پنل دانت پیس
کر خاموش ہونے پر مجبور ہو گیا۔

☆......☆......☆

دور مشرق کی سمت افق پر شام کے سرخی مائل سناٹے اترے ہوئے تھے بلند و
بالا نہنگ اور کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ کے اوپر دن بھر کے تھکے ماندے پرندوں کی
ترتیب وار مست حال ڈاریں بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔فضا میں آمد سرما کی ہلکی ہلکی
یخ بستگی اترنے لگی تھی۔مٹر اور چنوں کے کھیتوں کے درمیاں سانپ کی طرح بل کھاتی
پگڈنڈی پر نازک اندام سوہنی پانی سے بھرے دو گھڑے اٹھائے چلی آ رہی تھی ایک
گھڑا اس کے سر پر دھرا تھا جب کہ دوسرا اس نے اپنی لچکیلی کمر کے قیامت خیز لوچ میں
ٹکا رکھا تھا۔اس نے مخصوص روایتی قسم کا تھری لباس پہن رکھا تھا۔تانبے جیسی رنگت پر
پیلی چنری، چمکتا ہوا گیروا گھاگھرا اور شوخ رنگ کی چولی نے اس کے حسن کی سادگی و
پرکاری کو ایک عجیب سی کشش بخشی ہوئی تھی۔کانوں میں چاندی کے بالے اور کندنی
کہنیوں تک پلاسٹک کے سفید کڑے اور ستواں ناک پر دمکتے ہوئے ابلق نے اسے
بالکل ایک خوب صورت اور ثقافتی نمونہ بنا ڈالا تھا۔اس کی رنگت شہابی تھی، البتہ اس کی
بڑی بڑی سرکیں اور گہرائی لیے ہوئی بڑی بڑی آنکھوں میں موئن جو دڑو کی سی اداسی
تھی۔وہ قدرے تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی کہ اچانک ایک بد ہیبت سا شخص اس
کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

سوہنی اسے دیکھ کر ٹھٹھکی اور رک گئی۔اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی سوہنی کے

معصوم سے چہرے پر پہلے لحظہ بھر خوف اور پھر انتہائی نفرت خیزی کے تاثرات ابھر آئے ۔وہ بدہیت سا شخص بھی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے بھدے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ لیے اس کی جانب گھورے جارہا تھا۔

"میرا رستہ کیوں روکا ہے۔۔۔۔ہٹ پرے۔" سوہنی نے ترخ کر قدرے حقارت سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"اڑی چھوکری! غصہ کیوں کرتی ہے؟ ایک بار میری بات سن لے پھر نہیں آؤں گا تیرے آگے۔" اس نے معنی خیز خباثت سے کہا۔

یہ دادن تھا۔دبی ہوئی اقامت مگر جثے کے لحاظ سے بیل ہی معلوم ہوتا تھا رنگت اس کی الٹے توے کی سی سیاہ تھی۔سوہنی کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا۔غصے کی تپش اور اوپر سے دو پانی سے لبالب بھرے گھڑوں کے بوجھ نے اس کی سانس پھلا دی تھی۔وہ غصے سے ہانپتے ہوئے بولی۔

"میں کہتی ہوں' ہٹ جا میرے رستے سے ورنہ۔۔۔ورنہ میں تیری شکایت ادا پنل سے کردوں گی۔وہ کلہاڑی سے تیرے ٹوٹے کرڈالے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا مگر دادن پر اس کی دھمکی کا مطلق اثر نہ ہوا۔وہ بدستور اپنی جگہ کھڑا ڈھٹائی کے ساتھ بڑی اوباشانہ نظروں سے سوہنی کے حسین سراپے کو غور سی گھورتے ہوئے لوفر پن سے بولا۔

"اڑی او۔۔۔چھوکری! تیرا بھائی کیا میرے ٹوٹے کرے گا۔ٹوٹے تو تیری حسین جوانی نے پہلے ہی میرے کرڈالے ہیں۔" سوہنی اس کی اس بات پر بری طرح تلملانے لگی۔

"شکل دیکھی ہے اپنی آئینے میں۔میں کہتی ہوں ہٹ آگے سے۔"

"نہیں ہٹوں گا۔" وہ ہٹیلے سے بولا۔

"تجھے آج میری بات سننا ہوگی۔"

وہ اس کی بات تو کجا اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی مگر اس نے کڑے دل سے سوچا کہ آج روز روز کی ذہنی اذیت سے چھٹکارا پا ہی لینا چاہیے چنانچہ وہ چپکی کھڑی رہی مگر اس کے چہرے پر ہنوز نفرت بھری پرچھائیاں طاری تھیں۔دادن اسے خاموش کھڑا دیکھ کر دل ہی دل میں خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بولا۔

"بس۔۔۔۔یہ کہنا تھا سوہنی کہ مجھ میں کیا برائی ہے۔اچھا کھاتا پیتا ہوں زمینوں کا مالک ہوں۔تو اگر مجھ سے شادی کرلے تو رانی بنا کر رکھوں گا تجھے۔"

"بس۔۔۔یا اور کچھ؟"

"اور۔۔۔۔اور۔۔۔۔یہ کہ۔۔۔۔میں تیرا جواب سننا چاہتا ہوں۔تو عیوضے کی ذرا فکر نہ کر۔تیرے ماں پیو کو اتنا روپیہ دوں گا کہ ساری زندگی آرام سے گزاریں گے۔"

سوہنی کی فطرت دوسری سیدھی سادی لڑکیوں سے مختلف تھی اور نہ ہی وہ ڈری سہمی رہنے والی لڑکی تھی۔اس نے آٹھ جماعتیں پڑھ رکھی تھیں۔تعلیم نے اسے سنوارا تھا اسے شعور عطا کیا تھا۔وہ اپنا برا بھلا بہتر طور پر سمجھتی تھی۔اس نے آج دادن کو آڑے ہاتھ لینے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا چنانچہ اس نے خاموشی سے پانی کا مٹکا زمین پر رکھا دادن کھڑا امید بھری نظروں سے اس کی طرف تکے جارہا تھا۔اس کے بعد سوہنی نے جلتی سلگتی نظروں سے دادن کے بدہیت سیاہ رو چہرے کی طرف گھور کر نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"میں نے تیری بات سن لی اور اب تو بھی آخری بار میری بات کان کھول کر سن لے۔اپنے گھر جا اور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ انسانوں والی زندگی بسر کر بڑھاپے میں یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے۔رہی میری تجھ سے شادی کی بات تو میں تیرے سے شادی کرنے سے زیادہ بہتر زہر کھا کر مرجانا پسند کروں گی۔اب دوبارہ میرے راستے میں آنے کی جرأت نہ کرنا۔ورنہ تیرے جیسے بدمعاش آدمی کی بے عزتی کرنے

میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کروں گی۔'' یہ کہہ کر سوہنی نے غصے سے بھناتے ہوئے مٹکا اٹھا کر دادن کے قدموں کے قریب دے مارا اور پاؤں پٹختی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

احساس ذلت کے مارے دادن کے مکروہ چہرے پر وحشتیں امڈ آئیں اور وہ معاندانہ نظروں سے سوہنی کو جاتے دیکھتا رہا۔

''تیرا غرور جلد توڑ دوں گا چھوکری!'' وہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔

☆......☆......☆

سرمد کھیتوں سے تھکا ہارا گھر پہنچا۔ وہ اپنے چچا زاد پنل کا ہم عمر ہی تھا اور اس جیسا کڑیل اور گھبرو جوان تھا مگر پنل کے برعکس وہ ٹھنڈے دماغ کا ایک سیدھا سادہ جوان تھا۔ جھگڑے فساد سے دور ہی بھاگتا تھا اور اپنے بڑوں کی لکیر والی فقیری اختیار کیے ہوئے تھا۔

گھر خالی تھا۔ ابھی اس کے ماں باپ کھیتوں سے نہیں لوٹے تھے البتہ سرمد اپنا کام معمول سے ذرا جلد نمٹا کر واپس آ گیا تھا۔ گھر گارے مٹی کی کچی دیواروں پر مشتمل تھا جس میں دو کمروں کے نام پر کچی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ کچا صحن البتہ خاصا کشادہ تھا جہاں ایک طرف چارہ کترنے کی ''کتر مشین'' اور وہیں قریب ہی ناند کے قریب ایک بدنما چھپر تلے کھرلی کے پاس ایک دودھیل بھینس بھی بندھی ہوئی تھی ایک مرغی چوزوں کی فوج ظفر موج کے ساتھ کڑ کڑاتی پھر رہی تھی۔ سرمد نے ایک کونے میں لگے ہینڈ پمپ سے منہ ہاتھ دھویا پھر اپنے کاندھے پر دھرے انگوچھے سے منہ ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے داہنی جانب والی دیوار پر بنی ایک چھوٹی سی کھڑکی کی طرف دیکھا جو اس کے چاچے ہاری حسین بخش کے گھر کے صحن میں کھلتی تھی کھڑکی بند تھی۔ یہ ایک آدم گزار کھڑکی تھی جس کے چوبیس چوکھٹے میں کوئی گرل یا سلاخیں نصب نہیں تھیں۔ معاً کھڑکی کے دونوں پٹ وا ہوئے اور سوہنی کا من موہنا چہرہ ابھرا۔ وہ وہاں سے سرمد کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اسے دیکھ کر سرمد کے دل

کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہونے لگی۔ وہ شرمیلے انداز میں دیکھ کر مسکرایا اور پھر صحن میں بچھی کھری چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ارے سرمو! وہاں کیوں بیٹھ گیا ہے؟ ادھر آ ناں!'' سوہنی نے بڑے دلارے سے اس سے کہا۔ سرمد ذرا گھبرا گیا۔ سوہنی کھنکتی ہوئی آواز میں ہنسی پھر جیسے اس کی گھبراہٹ کی وجہ جان کر بولی۔

''آ جا ادھر میرے گھر میں بھی کوئی نہیں ہے۔'' سرمد کو ذرا اطمینان ہوا تو وہ چارپائی سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گیا۔

''سرمو! اتنا ڈرتا کیوں ہے رے! آخر کو ہم دونوں۔۔۔۔''

سوہنی نے ایک ادائے دلربائی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ذرا شرمیلے انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ مگر سرمد اس کی ادھوری بات کا مطلب جان کر بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔پر۔۔۔۔یہ اچھا نہیں لگتا ابھی۔''

''کیا اچھا نہیں لگتا؟'' وہ اٹھلا کر بولی پھر ایک ادائے دل آرا سے اس نے اپنی چمکیلے پراندے والی چھن چھن کرتی چوٹی کو پشت سے سینے پر پھنکارا اور اس سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''ہم کیا کرتے ہیں؟ کیا تھوڑی سی باتیں بھی نہیں کر سکتے ایک دوسرے سے۔۔۔؟''

''کیا بات کریں؟'' سرمد ہونقوں کی طرح اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ سوہنی کو اس کے بھول پن پر بے اختیار ہنسی آ گئی بولی۔

''تو تو بالکل بھولا ہے۔ اچھا سن! یہ بتا تجھے میں اچھی لگتی ہوں؟ سرمد نے اس کی بات پر ایک نظر چونکتی ہوئی اس پر ڈالی پھر ہلکی سی مسکراہٹ سے فوراً سر ہلا دیا۔

''یہ کیا۔۔۔؟ زبان نہیں ہے تیرے منہ میں جو یوں سر ہلا دیا۔''

"تو اور کیا کروں ۔۔۔۔؟ تو نے پوچھا میں اچھی لگتی ہوں میں نے ہاں کہہ دی۔" سرمد نے ہولے سے کہا تو سوہنی بولی۔

"تو بھی پورا دا چھر ہے! زبان سے بول کتنی اچھی لگتی ہوں تجھے؟" سوہنی بھی اسے چھوڑنے والی کہاں تھی۔ سرمد بھی جیسے جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"اچھا بابا! تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔۔۔ اب بس!"

"سرمو تجھ سے ایک بات کہوں؟" سوہنی نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا

"کون سی بات؟" وہ مستفسر ہوا۔

"بس رہنے دے!" کچھ سوچ کر سوہنی چپ ہوگئی۔ اچانک دروازے پر آہٹ ابھری۔

"چل بند کر اب کھڑکی لگتا ہے بابا اور اماں آ گئے ہیں، میں چلا" سرمد نے جلدی سے کہا اور پھر واپس چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔ سوہنی نے جلدی سے بے آواز کھڑکی بند کردی۔

☆......☆......☆

دو مرغ آپس میں لڑلڑ کر لہولہان ہو رہے تھے اور ان کے گرد جمگھٹا بنائے لوگ انہیں بہ آواز بلند ہلہ شیری دے رہے تھے، مگر ان میں دو افراد زیادہ پرجوش اور سرگرم دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کادو موالی اور دوسرا دادن۔

"واہ رے میرے راکٹ! بھگا دے دشمن کو ۔۔۔۔ آگے بڑھ ۔۔۔۔ ہوڑ ۔۔۔ ہوڑ ۔۔۔ دشمن!" دادن نے جوش سے بھرے ہوئے اپنے مرغے کو ہلا دیا۔ اس کے مرغ کا میدانی نام راکٹ تھا۔ مخالف سمت میں کھڑے اپنے ساتھیوں کے آگے کھڑے منحنی سے خاکستری رنگ اور لمبوترے چہرے والے کادو موالی نے بھی اپنے مرغے کا جوش بڑھاتے ہوئے چلا کر کہا۔

"شاباش میرے لانچر! آڑا دے دشمن کو ۔۔۔ بھگا دے دشمن کو

۔۔۔ آگے بڑھ۔" دونوں مرغے بھی شاید اپنے اپنے مالکوں کی ہلہ شیری کی زبان خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر دونوں نے اچھل اچھل کر اپنے نوکیلے پنجوں اور ٹھونگوں سے ایک دوسرے پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ میدان میں ایک بار پھر لوگوں کے بم چخ کا شور ابھرا۔ پھر اچانک دادن کے راکٹ کو کادو موالی کے لانچر پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا اور اس کے انگوٹھے پر چڑھے ہوئے فولادی نیش نے لانچر کی ایک آنکھ نکال دی۔ بس پھر کیا تھا کادو موالی کا مرغا میدان چھوڑ کر بھاگا۔ دادن کے حواریوں نے بہ آواز بلند اس کے راکٹ کے حق میں نعرے بلند کرنا شروع کر دیے اور پھر دونوں خفتیوں (دادن اور کادو موالی) نے یک دم آگے بڑھ کر اپنے اپنے مرغوں کو پکڑ لیا۔

"چل رے کادو! نکال ۔۔۔۔ دو ہزار روپے۔" دادن نے پژمردہ سے کھڑے کادو موالی سے کہا اور پھر اس نے اپنی میلی چیکٹ صدری سے ہزار کا ایک میلا کچیلا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"یہ ہزار لے لے باقی بھی میں دے دوں گا۔"

"نہیں۔ مجھے ابھی دے شرط کے پورے پیسے۔ میں تجھے ایسے میدان سے نہیں جانے دوں گا۔" دادن فوراً لڑنے مرنے پر اتر آیا۔ ناچار کادو موالی نے اپنی راک (تہبند) کی ڈب سے پانچ پانچ سو کے مزید دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے اور اپنا سا منہ لے کر اپنے راستے پر ہولیا۔ وہاں موجود دادن کے ساتھیوں نے اسے گھیر لیا اور بابل خان کے چھپر ہوٹل پر دودھ پتی پلانے کا اصرار کرنے لگے دادن خوش تھا۔ وہ اپنے راکٹ (مرغ) کو اپنی بغل میں دبائے پیار کر رہا تھا پھر وہ بولا۔

"اڑے بابا! تم سب بابل کے ہوٹل میں چلو میں اپنے راکٹ کو ذرا مرہم اور دوا دے کر کے آتا ہوں۔" اس کے حمایتی نعرے لگاتے بابل خان کے ہوٹل چلے گئے۔

دادن اپنے گھر پہنچا۔ گھر اگرچہ کچی دیواروں پر مشتمل تھا مگر کافی کشادہ تھا
دو بڑے کمرے اور ایک چھوٹا کوٹھری نما کمرہ تھا۔ یہ اس کے راکٹ کے لیے مخصوص تھا
صحن کے وسط میں ایک رلی بچھی چارپائی پر ایک فربہ اندام عورت بیٹھی تھی جو چارپائی پر
دراز دس بارہ سال کے ایک بچے کے سر پر برف کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ بچہ بخار سے
پھنک رہا تھا اور عورت جو اس کی ماں تھی۔ عالم پریشانی اور غم سے نڈھال زیرلب
بدبدا رہی تھی۔ وہ خدا سے بچے کی صحت یابی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ یہ زلیخاں تھی
دادن کی بیوی۔ وہ اپنے حلیے سے دکھوں کی پوٹلی نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد
حلقے پڑے ہوئے تھے۔ بچے کی تیمارداری اور بے آرامی کے باعث خود وہ بھی نڈھال
ہو رہی تھی۔ وہ تیس پینتیس کے لپیٹے میں تھی۔

"اڑے رمضو کے پیو! تجھے ہماری پرواہ بھی ہے کہ نہیں ۔۔۔" وہ اپنے
شوہر دادن کو دیکھ کر جلدی سے چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تجھے اللہ سائیں کا واسطہ میرے بچڑے (بچے) کو حکیم سائیں کے پاس
لے جا اس کا تاپ (بخار) نہیں ٹوٹ رہا۔"

دادن نے خشمگیں سی نظروں سے اسے گھورا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر
پستوں کی ڈھیری نکال کر مرغ کے آگے رکھ دی۔ مرغا جلدی جلدی اس کی پھیلی ہوئی
ہتھیلی پر چونچیں مار مار کر پستے کھانے لگا۔ دادن اسے مصروف کرنے کے بعد اپنی بیوی
سے بولا۔

"موسمی بخار ہے ۔۔۔ اتر جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ اندر کوٹھری میں آ گیا
مرغے کو آہستگی سے نیچے اتارا پھر ایک چھوٹے سے بکسے سے مرہم پٹی کا سامان نکال
کر مرغے کو مرہم لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ پھر
صحن سے گزرتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو اس کی بیوی زلیخاں ہاتھ جوڑتے
ہوئے اس کے سامنے آ گئی اور روہانسے لہجے میں التجا کر کے بولی۔

"تھوڑے پیسے تو دے دے۔ رمضو کو حکیم کے پاس لے جاؤں کتنے دنوں
سے گریب بخار میں تڑپ رہا ہے۔" دادن نے اسے کرخت نظروں سے گھورا پھر
جیب سے دس کا مڑا تڑا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ پھر باہر نکل گیا۔ بیچاری زلیخاں
کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑے دس کے میلے کچیلے نوٹ کو دیکھتی کبھی مرغے کی کوٹھری کی
طرف۔

☆......☆......☆

دادن بابل خان کے چھپر نما ہوٹل پہنچا تو اس کے یار باش حمایتی اس کے
کھاتے میں دودھ پتی پینے میں مشغول تھے۔ دادن نے ایک پیش گار چھوکرے کو
جیب سے سو کا کرارا نوٹ نکال کر تھما دیا اور پھر وہاں سے سیدھا منشی میرو کے ہاں پہنچا
دادن کو یقین تھا کہ منشی میرو اس وقت اپنے گھر میں ہو گا۔ منشی میرو سے اس کے پرانے
مراسم تھے۔ اس نے دادن کو اوطاق میں بٹھا دیا۔

"چائے پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر منشی اوطاق کے ایک
دوسرے صحن میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو دادن نے منع کرتے
ہوئے کہا۔

"اڑے بابا رہنے دے چائے میں پی کر ہی آ رہا ہوں۔ ادھر آ ۔۔۔ ذرا
بیٹھ میرے ساتھ آج تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔" منشی میرو خاموشی سے اس کے
سامنے والی ایک کھری چارپائی پر بیٹھ گیا اور مستفسرانہ نظروں سے دادن کے پرسوچ
چہرے کی طرف تکنے لگا۔ پھر دادن اس سے بولا۔

"یار منشی میرو! تو ہی کچھ میرے مسئلہ کا حل بتا اور میری مدد کر۔"

"اڑے بابا! بتا تو سہی کیا مسئلہ ہے۔" منشی نے پوچھا۔

"ارے یار! وہ ہاری حسین بخش ہے نا ۔۔۔ اس کی دھی سوہنی پر میرا دل
آ گیا ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے بتایا تو منشی کے منحنی چہرے

پرخباثت بھری مسکراہٹ ابھری۔

"اچھا! یہ بات ہے؟" وہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تو پھر سنگ لے لے۔۔۔۔ جا کر حسین بخش سے اس کی دھی (بیٹی) کا۔"

"ہاں۔ ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" دادن پرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"پر میں کیسے جاؤں؟ یہ کام تو کر دے۔ بھرجائی (منشی کی بیوی) کو تو ساتھ لے جانا میرا کام ہو جائے گا تو دونوں کے سوٹ پکے۔ شہر سے لے کر آؤں گا مٹھائی بھی۔" دادن نے اسے لالچ دیا۔ منشی بھی ایک کائیاں تھا کہ دادن نے اس مشکل کام کے لیے اسے ہی کیوں چنا تھا کہ رئیس کا منشی ہونے کی وجہ سے حسین بخش پر ذرا رعب پڑے، اس لیے وہ بھی مکاری سے بولا۔

"یار دادن! بس صرف دو سوٹ اور مٹھائی۔۔۔ سوہنی جیسی پری کے لیے تو تجھے اپنی جیب بھی ڈھیلی کرنی پڑے گی۔"

"اچھا اچھا! سمجھ گیا تیرا مطلب؟ تو تو میرا پکا یار ہے' فکر نہ کر۔۔۔ نوٹ بھی دوں گا۔" دادن نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"اچھا! عوضہ کتنا طے کروں؟" منشی نے دادن سے پوچھا۔

"یہی پچاس ہزار۔"

"یہ تو بہت تھوڑا ہے۔" منشی میرو نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ایک لاکھ کی بات کرے تو کام کی کچھ امید بن سکتی ہے۔" دادن اس بات پر کچھ سوچنے کے بعد رضامند ہو گیا۔

"اور میرے پندرہ ہزار تیار رکھنا۔۔۔۔ میں چلا۔" وہ اٹھنے لگا۔ دادن بھی کھڑا ہو گیا۔

"مجھے منظور ہے۔۔۔۔ بس تو یہ کام کر دے میرا۔"

بے فکر رہ۔۔۔۔ میں آج ہی اپنی زال (بیوی) کے ساتھ حسین بخش کے گھر جاتا ہوں۔" منشی نے اسے تسلی دی۔ دادن خوش ہو گیا۔

☆......☆......☆

منشی میرو اور اس کی بیوی کو اپنے پیوند زدہ دروازے پر دیکھ کر بے چارہ ہاری حسین بخش آنکھیں پھاڑے غیر یقینی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"سائیں! آپ نے تو ہمارے گھر کو بڑی رونق بخش دی اس گریب کی عزت ہو گئی۔۔۔۔ آؤ۔ آؤ۔۔۔ بھلی کرے آیو۔"

صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ گھر میں اتفاق سے سب ہی موجود تھے سوائے محمد پنل کے۔ حسین بخش نے منشی اور اس کی بیوی کے لیے فوراً صحن میں چارپائی بچھائی اور پھر صاف ستھری رلی ڈال دی اور اپنی بیوی مختاراں سے چائے پانی کا کہا تو منشی اسے منع کرتے ہوئے بولا۔

"کسی شے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔ ادھر بیٹھ۔ تیرے سے ایک ضروری بات کرنا تھی حسین بخش!"

حسین بخش بے چارہ حیران و پریشان ایک ٹک منشی میرو کا چہرہ تکنے لگا۔ اسے حیرت سے زیادہ پریشانی ہو رہی تھی کہ آخر رئیس جابر خان کا منشی میرو اس غریب کے ہاں چل کر ایسی کون سی اہم بات کرنے آیا ہے جو اس نے اپنے کسی رئیس کی اوطاق میں بلا کر کرنے کی بجائے خود اس کے گریب خانے میں آیا ہے۔

"منشی صاحب! مجھے بلا لیا ہوتا آ پڑیں اوطاق میں۔۔۔۔ تم نے کیوں تکلیف کی؟" حسین بخش نے فروتنی سے کہا۔

"اڑے بابا! ایک ہی بات ہے۔۔۔۔ پریشان مت ہو تو۔۔۔۔ سن ذرا۔" منشی میرو نے مکارانہ انسیت سے کہا پھر بولا۔

"تو بھی کیا یاد کرے گا کہ تیری دھی سوہنی کے نصیب کھولنے آ گیا ہوں

میں۔‘‘اس کی بات پر حسین بخش کبھی منشی کا منہ تکتا تو کبھی اپنی بیوی مختاراں کا منہ دیکھنے لگتا۔

’’میں سمجھا نہیں منشی صاحب!‘‘ وہ منشی سے الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

تو منشی میرو نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔’’سیدھی بات ہے۔۔۔اچھا سن دادن کو تو تو جانتا ہی ہے ناں۔۔۔خاصا پیسے والا ہے اور شریف بھی۔بڑا سیدھا سادہ آدمی ہے۔میرا تو یار ہے پکا۔۔۔اس کے لیے میں تیری دھی سوہنی کا رشتہ لینے آیا ہوں۔۔۔بول اب کیا کہتا ہے۔‘‘اس کی بات سن کر بے چارے حسین بخش پر یکدم سکتا طاری ہو گیا۔

خاصی دیر تک غریب کے منہ سے کوئی الفاظ تک ہی نہ برآمد ہو سکے۔

’’پورے ایک لاکھ دے گا۔۔۔دادن۔۔۔تیری دھی عیش کرے گی اور سکھی رہے گی اس کے پاس۔‘‘منشی اسے شاید خوشی کے مارے گم دیکھ کر بولا۔

حسین بخش سے ابھی کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔وہ اسے کیا جواب دیتا بلکہ وہ تو یہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں اس کا جوان بیٹا پنل نہ آ جائے۔وہ تو پہلے ہی منشی پر ادھار کھائے بیٹھا تھا اس پر اگر اسے یہ پتہ چل جاتا کہ منشی جہاں خود بہ نفس نفیس چل کر کیا کرنے آیا تھا تو کوئی بعید نہ تھا وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔کیونکہ وہ ہی کیا پورا گوٹھ دادن کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھا وہ کس قماش کا آدمی تھا یہ بھی پورا گوٹھ جانتا تھا۔

’’مم۔۔۔میں۔۔۔کیا جواب دوں دراصل سس۔۔۔سائیں وہ۔۔۔میں نے سوہنی کی بات وڈے سکھیو کے بیٹے سرمد سے طے کر دی ہے۔‘‘اسے بالآخر یہی جواب سوجھا تھا۔

’’بات سے کیا ہوتا ہے۔۔۔۔میں تو سیدھے نکاح کی بات کر رہا ہوں۔‘‘منشی نے کہا۔اس شخص کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ ہاری حسین بخش اسے کیا جواب دینے والا تھا۔حسین بخش کے چہرے پر پرچھائیاں سمٹ آئی تھیں آخر کار وہ

اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت سماجت سے بولا۔

’’منشی صاحب! ہم غریب لوگ ہیں۔۔۔۔۔ہمارا دادن جیسے زمیندار سے بھلا کیا جوڑ؟ میرے بڑھاپے پر رحم کر۔۔۔۔۔ہمیں اپنے حال پہ مست رہنے دے۔‘‘

’’اڑے یار! تو ایسے ڈر رہا ہے جیسے۔۔۔۔‘‘منشی میرو نے ابھی اس تشفی آمیز انداز میں اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا۔حسین بخش نے ٹھٹکی ہوئی نظروں سے وہاں دیکھا اور سن ہو کر رہ گیا۔اس کا بیٹا محمد پنل اندر داخل ہو رہا تھا پھر جیسے ہی اس کی نگاہ منشی میرو پر پڑی۔وہ ایک لمحے کو اپنی جگہ پر ساکت و جامد ہو کر رہ گیا۔

’’اچھا میں چلتا ہوں۔تیرے جواب کا انتظار کروں گا۔‘‘منشی میرو یہ کہہ کر وہاں سے کھسکنے کے انداز میں چلا گیا۔

’’بابا! یہ خبیث یہاں کیا کرنے آیا تھا؟‘‘پنل نے خاصی ناگواری کے ساتھ باپ سے پوچھا۔حسین بخش ایک دم گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

’’ایسے ہی آیا تھا۔فصلوں کی کٹائی کا پوچھ رہا تھا۔کتنے جریب تک ہو گئی ہے۔‘‘وہ بیٹے سے جھوٹ بولنے پر مجبور تھا مگر رسوئی میں ماں کے ساتھ دم بہ خود بیٹھی سوہنی نے باپ کا جھوٹ پکڑ لیا اور فوراً رسوئی سے باہر نکل آئی پھر باپ سے بولی۔

’’بابا جھوٹ کیوں بولتا ہے۔۔۔۔صاف صاف کیوں نہیں بتاتا ادا کو وہ خبیث بڈھا تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟‘‘باپ نے غصے سے بیٹی کو گھورا۔

’’چل جا اندر۔۔۔۔باتوں میں کان لگائے رکھتی ہے۔‘‘پھر وہ بیٹے سے جبراً مسکرا کر بولا۔

’’چل پٹ! تو مانی ٹکر کھا لے۔تھکا ہوا ہے۔‘‘

"نہیں بابا کوئی بات ہے۔۔۔تو مجھ سے چھپا رہا ہے۔ پہلے بتا۔ وہ مردود منشی میرو یہاں کیوں آیا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ ہمارے دروازے کے قریب سے بھی نہیں گزرتا تھا۔" پنل نے باپ کو پکڑ لیا۔ حسین بخش نے ایک درشت نگاہ قریب کھڑی اپنی بیٹی سوہنی پر ڈالی اور سوہنی خاموشی کے ساتھ وہاں سے کھسک گئی۔ وہ اب مطمئن تھی کہ اس کا باپ اب اپنے غیرت مند بیٹے کے سامنے کچھ چھپا نہ سکے گا۔ حسین بخش کو بھی یہ بخوبی علم تھا وہ بولا۔

"اچھا! اچھا بتاتا ہوں۔ پہلے تو مانی ٹکر (روٹی وغیرہ) تو کھالے۔"

"اصل بات کو سنے بغیر میں روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔"

پنل حسب عادت اڑ گیا۔ حسین بخش پریشان ہو گیا۔ پنل باپ کو متذبذب پا کر اس کے قریب آ گیا۔ باپ کو اصل بات بتانا ہی پڑی' جسے سن کر پنل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ باپ نے فوراً اپنی ٹوپی اتار لی۔

"نہیں بابا! بہت ہو گیا۔ میں ابھی آتا ہوں۔" پنل نے قہر آلود لہجے میں کہا پھر کلہاڑی اٹھالی۔ باپ اس کے آگے آ گیا اور گڑگڑا کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"میرے بڑھاپے کا واسطہ۔۔۔یوں غصہ نہ کر۔۔۔اڑی او۔۔۔پنل کی ماں۔۔۔روک اسے۔۔۔۔یہ ہم پر قیامت لانے والا ہے۔"

مختاراں بھی اپنے گھبرو بیٹے کو غیرت کی آگ میں سلگتا دیکھ کر اسے روکنے کو دوڑی مگر پنل ان کی پرواہ کیے بغیر آندھی طوفان کی طرح گھر سے نکل گیا اور سیدھا رئیس جابر خان کی اوطاق میں پہنچا۔ وہاں منشی میرو ابھی ابھی پہنچا تھا اور ایک سرکنڈوں کے موڑے (مونڈھے) پر رجسٹر ڈ سنبھالے بیٹھا زمین پر پلتھیاں مارے بیٹھے چند مدقوق ہاریوں سے کرخت لہجے میں مخاطب تھا۔ پنل کو دیکھتے ہی وہ بری طرح چونک پڑا۔ پنل کے چہرے پر بگڑتے تیور دیکھ کر وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

"اڑے آ بابا چھوکرا! کیسے آنا ہوا؟"

"منشی! تو نے جرأت کیسے کی اس حرام زادے جواری کی اولاد دادن کے لیے میری بہن سوہنی کا سنگ (رشتہ) مانگنے کی؟" پنل دروازے پر ہی نہنگ کے درخت کی طرح کھڑے کھڑے غصے سے غرا کر بولا تو اس بار منشی میرو کا دماغ بھی الٹ گیا اور وہ اپنی گود میں پھیلے ہوئے رجسٹر کو بند کر کے یک دم غصے سے بھناتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا پھر عینک اتار کر اپنی چندی چندی مکارانہ آنکھوں سے پنل کو گھورتے ہوئے بولا۔

"اڑے چھوکرا! زبان سنبھال کر بات کر۔۔۔۔یہ آ پڑیں وڈے سائیں کی اوطاق ہے۔۔۔۔۔تیرا ویڑھا نہیں ہے یہ۔"

"منشی باغیرت لوگوں کے لیے ایک غریب ہاری کے گھر کا ویڑھا اور وڈے سائیں کی اوطاق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" پنل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شعلہ فشاں لہجے میں بولا۔

منشی میرو اس کی گرم جوش جوابی کارروائی پر یک دم مارے طیش کے موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا اور غصیلے لہجے میں پنل کو گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔

"اڑے چھوکرا تو جس عزت کی بات کر رہا ہے۔۔۔۔۔وہ بھی ہمارے رئیس کی دی ہوئی ہے۔۔۔اور تو آج اس کی اوطاق میں آ کر مجھے للکار رہا ہے۔ اپنی اوقات میں رہ۔"

"منشی! یہ عزت ہمیں کسی انسان نے نہیں اللہ نے دی ہے اور مجھے رئیس کا ہی لحاظ آتا ہے جواب تک خاموش ہوں۔" پنل نے غیظ آلود لہجے میں کہا۔

"اور کان کھول کر سن لے۔۔۔تو بھی اپنی حیثیت صرف فصلوں کے حساب کتاب تک رکھ۔ اگر دوبارہ کبھی میری بہن کا نام بھی تیری زبان پر آیا تو میں رئیس کا بھی لحاظ نہ کروں گا۔" یہ کہہ کے پنل واپس چلا گیا۔

منشی میرو کے چہرے پر چھائی سناٹے دار خاموشی کسی بڑے طوفان کا پتا دیتی محسوس ہو رہی تھی۔

پنل زخمی شیر کی طرح بپھرا ہوا وہاں سے سیدھا دادن کے گھر کی طرف چلا۔ راستے میں چاچا اللہ یار نے اسے بتایا کہ دادن بابل کے چھپر ہوٹل میں موجود ہے تو پنل نے سیدھا وہاں پہنچ کر ہی دم لیا۔

دادن اس وقت اپنے مرغ باز ختیوں کے ایک مختصر سے ٹولے کے درمیان لکڑی کے ایک سالخوردہ بینچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کی بائیں ہاتھ کی مٹھی میں بابو بیڑی دبی ہوئی تھی۔ پنل کو ہوٹل کے چھپرا حاطے میں حالتِ غیظ سے داخل ہوتے دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ ادھر پنل نے بھی دادن کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے قریب بڑھتے ہی اپنی کلہاڑی دونوں ہاتھوں میں سونت لی۔ دادن ایک لمحے کو بری طرح گھبرا گیا اگر بروقت اس کے آلی موالی ساتھی اور ہوٹل میں بیٹھے دوسرے گاہکوں نے پنل کو پکڑ نہ لیا ہوتا تو اس کی کلہاڑی دادن کا آج قصہ پاک ہی کر ڈالتی۔

"چھ۔۔۔۔چھوڑ دو۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔میں اس ذلیل کتے کو آج زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" پنل غیظ و غضب کے عالم میں غرایا اور چنگھاڑتی آنکھوں سے دادن کو گھورنے لگا۔

"اڑے چھوکرا! ہوش کر۔۔۔۔بس بابا بس۔۔۔۔کیا بات ہے۔۔۔۔اس کا فیصلہ ہم کریں گے۔" وہاں موجود لوگوں نے بپھرے ہوئے پنل کو پکڑے ہوئے یک زبان ہو کر کہا۔ وہ اپنے تئیں اس جھگڑے کو کاروباری سمجھے ہوئے تھے حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔

"دادن!۔۔۔کتے! میری بات کان کھول کر سن لے۔ دوبارہ میری بہن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو کلہاڑی سے تیرے ٹوٹے کر کے رکھ دوں گا۔ آج قسمت تھی تیری بچ گیا۔ ہر دفعہ ایسا نہیں ہوگا۔" پنل نے مغلوب الغضب ہو کر

دھاڑتے ہوئے اسے سرزنش کی۔

یہ معاملہ ہی ایسا تھا کہ دادن سمیت وہاں موجود اس کیا ساتھی بھی دم بہ خود سے کھڑے رہ گئے۔ پھر پنل قہر آلود نظروں سے دادن کو گھورتا ہوا پاؤں پٹخ کر وہاں سے واپس چلا گیا۔ ذرا دیر بعد بابل خان کا چھپر ہوٹل لوگوں کی آپس میں چہ مگوئیوں کے بیچ سے گونج رہا تھا۔

☆......☆......☆

محمد پنل کی رئیس جابر خان کے منشی میرو اور دادن کے ساتھ گرما گرمی کے بعد یہ معاملہ سرد پڑتا محسوس ہو رہا تھا لیکن جانے کیوں سکھیو اور بالخصوص پنل کے باپ حسین بخش کو یہ اسرار بھری خاموشی کسی بڑے نادیدہ طوفان کا ہی پیش خیمہ محسوس ہو رہی تھی۔

سکھیو اور حسین بخش نے اپنی ساری عمر ارضی ناخداؤں کے آگے ہاتھ جوڑے "حاضر سائیں وڈا" اور "برابر سائیں برابر وڈا" کر کے گزاری تھی۔ لہٰذا وہ ایسے لوگوں کی کینہ پرور عادات و خصلت سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ دونوں جہاندیدہ بھائی اب اندر سے ڈرے سہمے ہوئے تھے اب کبھی بھی ان پر کوئی بڑا اعتاب رئیس کی ناراضگی کی صورت میں نازل ہونے والا تھا کیوں کہ وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ خبیث دادن نے رئیس میرو کا دامن پکڑ رکھا تھا اور منشی رئیس کا دم چھلا تھا جوان کے خلاف گل کھلانے کے لیے بظاہر خاموشی سے مکاری کی بکل مارے بیٹھا تھا۔

بہر طور اب محمد پنل اپنے باپ حسین بخش کو سوہنی کی سرمد سے شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ موجودہ حالات میں دونوں گھرانوں کے افراد نے یہی بہتر سمجھا کہ اب سوہنی اور سرمد کی جلد از جلد شادی کر دینی چاہیے۔ دونوں گھرانے دوران خانہ شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ تب پھر ایک دن جب شادی کے تمام مراحل فیصلہ کن موڑ پر داخل ہوئے اچانک ایک روز ہاری حسین بخش کے بڑے بھائی

سکھیو نے اپنے بیٹے کی شادی سے صاف انکار کر دیا۔ حسین بخش اور اس کا بیٹا پنل بھونچکارہ گیا۔ ایک لمحے کو تو انہیں یقین ہی نہیں آیا تھا۔

"بھائی سکھیو! ی۔۔۔۔ی۔۔۔۔۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ ہوش میں تو ہے؟" حسین بخش نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔

اس وقت دونوں باپ' بیٹا اور حسین بخش کی بیوی مائی مختاراں سکھیو کے ہاں آخری بات طے کرنے آئی تھی کہ سکھیو نے دھماکہ کیا۔

سکھیو کا چہرہ اندرونی کرب کا غماز تھا۔ پاس ہی اس کی بیوی عنایتاں بھی موجود تھی۔ ان کا بیٹا سرمد البتہ باہر تھا۔ سکھیو نے اپنے بھائی کی بات پر ایک آزردہ سی ہمکاری بھری۔ پھر سر جھکاتے ہوئے نحیف سی آواز میں بولا۔

"ہاں بھائی! ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ سوہنی کا سنگ (رشتہ) اپنے بیٹے سرمد کیلئے لینے سے صاف انکار کرتا ہوں۔"

"مگر چاچا! یہ تجھے اچانک کیا ہو گیا ہے؟ تو نے تو زبان دے رکھی تھی۔" اس بار محمد پنل نے لب کشائی کی۔ اس پر گم صم بیٹھے سکھیو کی بیوی عنایتاں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"پٹ پنل! بس ہمیں سوہنی کا رشتہ منظور نہیں ہے۔"

"ادی! یہ کیا بات ہوئی؟ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" پنل کی ماں مختاراں نے غمناک پریشانی سے کہا تو سکھیو پریشان کن لہجے میں بولا۔

"سمجھ تو ہماری بھی نہیں آ رہا بھرجائی!" یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی سے منت بھرے لہجے میں بولا۔

"بھا! تو مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔ میں تیرا بڑا بھائی ہوں۔ پر میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔۔ تو۔۔۔ تو میری عمر کا سمجھدار آدمی ہے۔ میری مجبوری سمجھ گیا ہوگا تو۔۔۔ بس اس بات کو ادھر ہی ختم کر دے۔ ہم نے بھی آخر زندہ رہنا ہے۔" اس

کے ذومعنی دکھڑے کو جہاندیدہ حسین بخش فوراً سمجھ گیا۔ پھر وہ اپنی بیوی اور بیٹے سے بولا۔

"چلو واپس گھر۔" یہ کہہ کر وہ خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

یہ اس سے اگلے دن کا ذکر تھا۔ حسین بخش کو کھیتوں میں کام کرنے کے دوران رئیس جابر خان کے چند مسلح حواریوں نے فی الفور رئیس کی اوطاق میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ بے چارہ حسین بخش اسی وقت دل میں سو قسم کے اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ لرزتا کانپتا ہوا فوراً رئیس جابر خان کی اوطاق میں حاضری بھرنے جا پہنچا تھا۔

اوطاق خالی تھی۔ صرف چند مسلح حواری وہاں بیٹھے سگریٹ بیڑی پینے میں مصروف تھے۔ حسین بخش پر انہوں نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور بے چارہ ایک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ خاصی دیر بعد ایک بھاری بھرکم اور لحیم شحیم شخص اوطاق میں داخل ہوا۔ یہ گوٹھ کا بااثر وڈیرا رئیس جابر خان تھا۔ وہ ایک ساٹھ پاٹھا شخص تھا دراز قد بیش قیمت کاٹن کی مکلف کڑکڑاتی ہوئی بے داغ شلوار قمیض پر واسکٹ اور بالائی اجلی اجرک اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ازلی رعونت جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی وسمہ لگی گھنی داڑھی مونچھیں اور بھنوؤں نے اس کے مزاج کی کرختگی کو خاصا ابھارا ہوا تھا پاؤں میں چمڑے کی پشاوری جوتے کو چرچوں خرچوں پختہ فرش پر مارتا ہوا وہ ایک نسبتاً اونچے اور کشادہ پشتے والے سرکنڈوں کے بنے موڑھے پر براجمان ہوا۔ اس کے عقب میں منشی میرو بھی رجسٹر تھامے اندر داخل ہوا تھا۔

اوطاق میں یک دم جیسے درباری سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ایک کونے میں دبکا کھڑا حسین بخش اندر ہی اندر ہول کھا رہا تھا۔ رئیس جابر خان نے موڑھے پر براجمان ہوتے ہی ایک خشمگین سی نظر باری باری حسین بخش پر ڈالی اور پھر دوسرے ہی لمحے اوطاق پر

طاری اسرار بھری خاموشی کو ایک پاٹ دار آواز نے چاک کر ڈالا۔

"اڑے حسین بخش ادھر آ۔" جابر خان کی گونجیلی اور تحکمانہ آواز پر حسین بخش ہاتھ جوڑے لرزیدہ انداز میں چلتا ہوا ذرا قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"سوہنی تیری ہی دھی ہے ناں؟"

"ہاؤ۔۔۔۔۔سائیں وڈا!" ہاری حسین بخش جلدی سے بولا۔

"میں نے سنا ہے تو اپنی دھی سوہنی کا بیاہ آ پڑیں بھائی سکھیو کے بیٹے سرمد سے کرنا چاہتا ہے؟" رئیس نے نخوت بھرے لہجے میں کہا تو حسین بخش مرتعش سی آواز میں بولا۔

"بس۔۔۔سائیں وڈا! کرنا تو چاہتا تھا پپ۔۔۔پر۔۔۔۔بھا سکھیو نے اپنے بیٹے کی شادی میری دھی سے کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" اس کی بات پر رئیس کے بھاری بھرکم چہرے پر بڑی سنگین اور اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔

"ہوں! اس نے کافی عقلمندی دکھائی ہے اور اب تو بھی ذرا عقل سے کام لے۔"

"برابر سائیں بھوتار!۔۔۔برابر۔۔۔۔جیسا حکم ہو آپ کا۔" ہاری حسین بخش نے فدویانہ لہجے میں بدستور اپنے ہاتھ جوڑ کر رئیس جابر خان سے کہا۔

"سن میری بات۔"

"جی سائیں میں سن رہا ہوں۔"

"آ پڑیں دھی سوہنی کا بیاہ دادن سے کر دے۔ وہ بہت پیسے والا آدمی ہے تیری دھی سکھی رہے گی اس کے پاس۔ ہاں۔ بابا۔۔۔کیا بولتا ہے اب تو؟" رئیس نے جیسے مشورہ دینے کے انداز میں اسے حکم دیا اور حسین بخش سر سے پاؤں تک ایک الجھن آمیز سنگین پریشانی میں ڈوب گیا۔ رئیس جابر خان چند ثانیے اسے سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر کھردرے لہجے میں دوبارہ بولا۔

"اڑے بابا تو کس سوچ میں پڑ گیا۔۔؟"

"بس۔۔۔سائیں! دادن تو پہلے ہی شادی شدہ ہے اور اس کی عمر بھی دگنی ہے۔ بالآخر میری دھی اسکے ساتھ کیسے سکھی رہ سکتی ہے؟" بالآخر حسین بخش نے ذرا ہمت کر کے کہہ ڈالا۔

"اڑے بابا! مرد اور گھوڑے کی کوئی عمر دیکھی جاتی ہے۔" رئیس جھٹکے دار لہجے میں بولا۔

بے چارہ حسین بخش کیا جواب دیتا چپ ہو رہا۔ پھر رئیس جابر خان کی خاموشی کو اپنے تئیں اس کی رضامندی جان کر دوبارہ، کرکراتی آواز میں اس سے بولا۔

"ہاں بابا! ہمارا منشی اور اس کی بیوی کل تیری دھی (بیٹی) سوہنی کو انگوٹھی پہنانے آ رہے ہیں اور اسکے چند روز بعد نکاح بھی ہو جائے گا۔" حسین بخش اس کے حکم پر لرز کر رہ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"بس۔۔۔سائیں وڈا۔۔۔وہ۔۔۔"

"حسین بخش!" رئیس اسے متذبذب پا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔

"انکار کرنے سے پہلے یہ سوچ لے کہ تو ہماری اوطاق میں کھڑا ہے اور انکار سننے کی عادت نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تیرا انکار تیرے پورے خاندان کے لیے جنجال بن جائے۔" رئیس جابر خان کے گونج دار لہجے میں چھپی تہدید کو ہاری حسین بخش صاف محسوس کر کے اندر سے بری طرح کانپ گیا اور جلدی سے لرزیدہ آواز میں بولا۔

"برابر سائیں!۔۔۔۔برابر" یہ کہہ کر وہ منہ لٹکائے واپس چلا گیا۔

"سائیں بھوتار کے سر کی خیر ہو وے۔" ہاری حسین بخش کے وہاں سے جاتے ہی رئیس جابر خان کے قریب بیٹھے منشی نے مکارانہ چاپلوسی سے کہا۔

''ہاری حسین اپنے بیٹے پنل سے بہت خائف ہے۔ پنل ضرور اس کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا ناں سائیں! کہ اس دو ٹکے کا چھوکرہ کل اس سلسلے میں غصے سے لال پیلا ہو کر یہاں آیا تھا۔ ویسے بھی سائیں وڈا!! اس چھوکرے کا بڑا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ جب بھی فصلوں کی بٹائی کا وقت آتا ہے وہ ہمارے دوسرے دھاکوں (کھیت کے مزدوروں) کا دماغ خراب کرتا ہے کہتا ہے کہ محنت ہم کریں اور آدھی سے زیادہ فصل رئیس لے جاتا ہے۔ کامریڈ بننے کا بھوت سوار ہو گیا ہے اس کے سر پر۔'' اس نے بڑی چالاکی سے رلا ملا کر رئیس کے کان بھرے۔

''ہوں!'' اس کی بات پر رئیس نے غیر مرئی نقطے پر اپنی گھورتی نظریں مرکوز کرتے ہوئے غصے سے ہمکاری لی۔ پھر سنسناتے لہجے میں بولا۔

''اس چھوکرے کی یہ مجال! اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔'' اس کے لہجے میں اچانک ہی خوفناک سفاکی در آئی تھی۔ معاً دادن اوطاق میں داخل ہوا۔

''سائیں وڈا!! قہر (غضب) ہو گیا۔ آج اس چھوکرے پنل نے بابل کے ہوٹل میں میری سخت بے عزتی کی ہے۔ کہہ رہا تھا کہ منشی میرو نے میری بہن کا رشتہ لانے کی جرأت کیوں کی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔ وہ آپ کو بھی برا بھلا کہہ رہا تھا۔'' دادن نے رئیس کو ورغلایا۔ رئیس یک دم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور دھاڑا۔

''منشی!''

''حاضر سائیں بھوتار!''

''اب سب سے پہلے اس چھوکرے پنل کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''برابر سائیں! برابر۔۔۔۔۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔۔۔۔ خیر! میں ایسا کام کروں گا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ بس! آپ کا حکم ہو؟'' منشی مکاری سے بولا اور سائیں جابر خان نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اثبات میں سر ہلا

دیا۔

''سائیں ایک عرض ہے۔ آپ متعلقہ تھانے کے حوالدار حکم دادا کو ذرا اپنی اوطاق میں بلا لیں باقی کام آسان ہو جائے گا۔''

''حوالدار کو اسی وقت ہمارا پیغام دو کہ وہ ابھی ہماری اوطاق میں حاضر ہو۔'' رئیس جابر خان دانت کچکچا کر بولا اور منشی سینے پر ہاتھ رکھے مکاری سے بولا۔

''برابر سائیں برابر۔'' اس کے ساتھ ہی وہ سامنے کھڑے دادن کی طرف مکروہ مسکراہٹ سے دیکھنے لگا۔ دادن منشی میرو کی سازش بھانپ کر شاطرانہ انداز میں مسکرانے لگا۔

☆......☆......☆

سوہنی کو اس سارے گورکھ دھندے کی بھنک پڑ چکی تھی۔ آخر کو وہ بھی اس خاندان کی ایک فرد تھی۔ پھر وہ کیسے بے خبر رہ سکتی تھی کہ اس کے چاچا سکھیو نے اپنے بیٹے سرمد کے لیے اچانک اس کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے مگر سوہنی کو سب سے زیادہ دکھ سرمد کی طرف سے تھا کہ کم از کم اسے اس کی بے لوث محبت کا دم بھر لینا چاہیے تھا وہ کیوں بزدلوں کی طرح منہ چھپائے خاموش بیٹھا تھا۔ اسے سرمد پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ مرد ہو کر اس قدر مجبور تھا۔ ایک روز اس نے سرمد کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس وقت سوہنی کی ماں مختاراں گھر پر نہ تھی اور سرمد اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ سوہنی نے اپنی اجرک کی چادر سنبھالی اور بے دھڑک سرمد کے گھر جا گھسی۔ سرمد اسے تنہا پا کر ایک لمحے کو چونک سا گیا۔

''سرمو! تو کیسا مرد ہے ڑے! تو نے۔۔۔۔ تو نے۔۔۔۔ رئیس جابر خان اور اس مردود دادن کے دباؤ میں آ کر مجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔۔۔۔ کیوں؟ کیا میری محبت اتنی سستی تھی؟'' سوہنی نے غصے اور غم ناکی سے جوش میں کہا۔

تو سرمد نے حسب عادت کھسیانے لہجے میں گول مول جواب دیا۔

"میں نے تھوڑا ہی شادی سے انکار کیا ہے۔ وہ تو بابا نے انکار کیا ہے؟"

"شادی تو نے مجھ سے کرنی ہے یا تیرے بابا نے!" سوہنی نے فطری سرکشی سے بھنا کر کہا اور سرمد بے چارہ اپنی بغلیں جھانکنے لگا۔

"دیکھ سرمو! مرد بن' میں تجھے چاہتی ہوں۔ میری محبت کی قدر کر' لوگ تو اپنی محبت کے لیے سر تک لڑا دیتے ہیں مگر تو کیسا مرد ہے؟ بزدل ہے تو دادن کے سامنے اپنا منہ دبا کر بیٹھ گیا ہے۔" اس کی بات پر سرمد نے عجیب سی نظروں کے ساتھ سوہنی کی طرف دیکھا۔ پھر حتمی لہجے میں بولا۔

"سوہنی! میں اپنے ماں باپ کی بات رد نہیں کر سکتا۔ تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ چلی جا یہاں سے۔" اس کی بے اعتنائی پر سوہنی کی سرمگیں آنکھوں میں بے اختیار کرب و اندوہ کے آنسو نکل آئے، جسے وہ فوراً پیتے ہوئے ہونٹ چبا کر استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"ہاں، مجھے واقعی چلے جانا چاہیے۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ میں اب تک کسی مرد سے نہیں بلکہ ایک بزدل سے محبت کیے ہوئے تھی۔ تو تو محبت کے قابل ہی نہیں ہے۔ یہ میری غلطی تھی جو تجھے دل دے بیٹھی ہٹھ۔۔۔۔" حقارت آمیز انداز میں سوہنی پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

☆......☆......☆

"سائیں وڈا! آپ بے فکر رہیں۔ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہو گا۔" رئیس جابر خان کی اوطاق میں بیٹھے ایک پختہ عمر توندیل سے حوالدار حکم داد نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک سالم بھنے ہوئے پھٹور کو دانتوں سے بھنبھوڑتے ہوئے فدویانہ لہجے میں کہا اور اس کے سامنے والے کشادہ موڑھے پر براجمان جابر خان کی گھنی مونچھوں پر سفاکانہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ اس کے قریب ہی دو موڑھوں پر بیٹھے منشی میرو اور دادن بھی دانت نکالنے لگے۔ ان کے وسط میں ایک شیشے کی ٹاپ والی

میز پر ولایتی شراب اور آئس کیوب کے علاوہ بڑی سی ٹرے پر بھنے تیتر سالم رکھے ہوئے تھے اور حوالدار حکم داد ندیدے پن سے اپنے سامنے دھرے ان لوازمات آوارہ کو تکے جا رہا تھا۔

"سن لیا منشی اور دادن تو نے بابا!" حوالدار حکم داد کے گویا گرین سگنل دکھانے پر رئیس جابر خان نے سرسراتے لہجے میں ان دونوں سے کہا تو وہ دونوں رئیس کے معنی خیز لہجے کا مطلب فوراً بھانپ کر بولے۔

"برابر سائیں!۔۔۔۔۔ برابر۔۔۔۔۔ ہم سمجھ گئے۔"

"اب تمہارا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔"

"ہاؤ سائیں بھوتار! ایک تیر دو شکار۔۔۔۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔" منشی میرو نے مکاری سے مسکرا کر لقمہ دیا اور رئیس جابر خان ہولے ہولے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دینے لگا۔

☆......☆......☆

بظاہر حالات معمول پر آ گئے تھے' مگر معمول کے ان خاموش حالات میں کیسا مصائب بھرا طوفان چھپا ہوا تھا اس کا اندازہ جہاندیدہ سکھیو اور ہاری حسین بخش ہی کو تھا۔ سوہنی کا دل البتہ سرمد سے خراب ہو چکا تھا۔ پنل اپنے تئیں دادن کو مزہ چکھا چکا تھا اور رئیس جابر خان کے لاڈلے منشی میرو کو بھی دھمکا چکا تھا۔ وہ اب مطمئن تھا کہ اتنی بے عزتی کے بعد یہ دونوں خبیث پھر کبھی اس کی معصوم اور پھول سی بہن سوہنی کا سنگ (رشتہ) مانگنے کی کوشش نہیں کریں گے، مگر وہ ارضی ناخداؤں سے واقف نہ تھا جن کے سارے غلط فیصلے اس کے لیے "صحیح" ثابت ہوتے تھے۔ وہ جبر واستبداد کے زور پر جیتے تھے۔ ناانصافی کی چکی تلے غریبوں کو پیس کر اپنے خود ساختہ فیصلوں کو اثبات میں بدلنے کے عادی تھے۔

ایک روز اچانک چاچا سکھیو غصے میں بپھرا ہوا اپنے بھائی ہاری حسین بخش

کے گھر داخل ہوا۔اس وقت یہ سب گھر میں ہی موجود تھے۔سکھیو نے گھر میں داخل ہوتے ہی پنل کا گریبان پکڑلیا اور ساتھ ہی اسے ایک عدد تھپڑ بھی جڑ دیا۔پنل حیرت سے گنگ رہ گیا۔اس کا باپ حسین بخش بھائی کو سنبھالنے کے لیے لپکا۔

''اڑے بھائی سکھیو خیر تو ہے۔۔۔۔پاگل تو نہیں ہوگیا، جو میرے جوان پٹ (بیٹے) پر ہاتھ اٹھا رہا ہے؟''

''تیرے اس جوان پٹ نے میرے سیدھے سادے پٹ (بیٹے) سرمد کے ساتھ بدمعاشی کی ہے۔''سکھیو نے غصیلے لہجے میں اپنے بھائی سے کہا اور پنل سے بولا۔

''بتارے چھورا! تو نے کیوں میرے پٹ سرمد کو اپنے دوستوں سے پٹوایا ہے۔۔۔۔بول۔۔۔۔کیا اسے لاوارث سمجھا تھا تو نے؟''

''چاچا! آرام سے بات کر' مجھ پر تو کبھی میرے پیو (باپ) نے بھی ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔میں بھلا سرمد کو دوستوں سے کیوں پٹواؤں گا۔''پنل کو بھی غصہ آ گیا تھا۔اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان سکھیو کے ہاتھ سے چھڑایا۔سب پریشان ہو گئے۔

''میں خوب جانتا ہوں! میرے فرماں بردار پٹ سرمو نے تیری بہن سے شادی سے جو انکار کردیا ہے اس لیے تو نے اسے اپنے بدمعاش دوستوں سے پٹوایا ہے میں ابھی تھانے میں جا کر تیرے اور تیرے بدمعاش ساتھیوں کے خلاف رپٹ (رپورٹ) درج کرواتا ہوں۔''سکھیو غصے کے مارے بکتا جھکتا چلا گیا۔

وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔پھر جلدی انہیں لوگوں سے پتہ چلا کہ چند کلہاڑی بردار ڈھاٹا پوش چھوکروں نے سرمد کو خوب مارا پیٹا تھا اور لوگوں نے ان میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ میرے دوست پنل کی بہن سوہنی سے منگنی توڑنے کا انجام ہے۔۔۔۔زندگی چاہتا ہے تو اپنا فیصلہ واپس لے لے اور سوہنی کا سنگ

(رشتہ) قبول کرلے۔وہ بدمعاش چھوکرے زخمی سرمد کو دھمکی دے کر چلے گئے۔

القصہ کوتاہ۔۔۔۔پنل کو گرفتار کرلیا گیا۔حسین بخش روتا ہوا اپنے بھائی سکھیو کے پاس پہنچا اور پہلے قسمیں کھا کھا کر اپنے بیٹے محمد پنل کی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا پھر جب سکھیو نہ مانا تو اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''دیکھ منڈا بھرا!۔۔۔۔مجھے یہ سازش لگتی ہے۔۔۔۔تو نے میری دھی سوہنی سے آپڑیں پٹ سرمد کی منگنی توڑ ڈالی۔میں نے برا نہیں منایا۔کیوں کہ میں تیری مجبوری کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایسا تو نے رئیس جابر خان کے خوف سے کیا ہے۔پھر دیکھ! میں اپنے پٹ کو چنگی طرح جانتا ہوں بلکہ تو بھی تو اسے جانتا ہے۔وہ بھلا کبھی آپڑیں بھائی پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے؟''

اس کی بات سکھیو کے دل کو لگی اور یوں بات آئی گئی ہوگئی۔پنل جیل سے چھوٹ کر آ گیا۔بات ختم ہوگئی۔۔۔۔مگر وہ سادہ لوح نہیں جانتے تھے کہ ارضی ناخداؤں کے لیے تو ابھی بات شروع ہوئی تھی۔انہوں نے محمد پنل کو اس کی غیرت مندی کی سزا دینے کے لیے جس سازش کا تارِ عنکبوت تیار کیا تھا اسے اب کسنے کا وقت آچکا تھا۔

☆......☆......☆

محمد پنل کے جیل سے چھوٹنے کو آج دوسرا ہی دن تھا کہ کسی نامعلوم قاتل نے سرمد کو بندوق کا نشانہ بنا کر قتل کرڈالا۔

سرمد کے قتل پر پورا گوٹھ تھرا اٹھا۔سکھیو کے ہی نہیں بلکہ حسین بخش کے گھر میں بھی کہرام مچ گیا۔گوٹھ میں تیزی سے یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ یہ قتل محمد پنل کے سوا کسی نے نہیں کیا تھا۔کیوں کہ سرمد کے قتل سے چند دن پہلے ہی پنل نے اپنی بہن سوہنی کی منگنی توڑنے کی سزا دینے کے طور پر سرمد کو اپنے بدمعاش دوستوں سے بری طرح پٹوایا تھا۔ان افواہوں کو ارضی ناخداؤں کے کارپردازوں نے مزید ہوا دی

تھی۔ نتیجتاً محمد پنل کو آناً فاناً سرمد کے قتل کے شعبے میں پولیس گرفتار کر کے لے گئی۔ اس کے بوڑھے غریب ماں باپ اور بیوی ریشماں، جوان بہن سوہنی روتے پیٹتے رہ گئے تھانیدار حکم داد جو اب رئیس جابر خان کا راتب خوار بن چکا تھا۔ اس نے پنل کا چالان کر کے اسے فوراً لاک اپ کر دیا۔

دونوں گھرانوں میں کہرام مچ گیا تھا۔ سکھیو اور اس کی بیوی عنایتاں اپنے اکلوتے بیٹے سرمد کے قتل پر پچھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ سرمد ان کے بڑھاپے کا واحد سہارا تھا۔ ادھر ہاری حسین بخش اور اس کی بیوی مائی مختاراں اپنے کڑیل اور غیرت مند بیٹے محمد پنل کی گرفتاری پر ماتم کناں تھے۔ پنل کی جوان بیوی ریشماں نے تو رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس کی بہن سوہنی بھی آزردہ تھی۔ ارضی ناخداؤں کی سازش کامیاب ہو چکی تھی۔

ہاری حسین بخش روتا پیٹتا ہوا رئیس جابر خان کی اوطاق میں پہنچا اور اس کے قدموں میں گر پڑا۔

”سس۔۔۔سائیں وڈا! میرے بچڑے کو بچا لو۔ وہ بے گناہ ہے۔ وہ غصے والا جوان ضرور ہے مگر میں جانتا ہوں وہ کسی کا خون کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس کی داد فریاد پر رئیس جابر خان نے غصیلے انداز میں اس سے کہا۔

”تیرا بیٹا خونی ہے۔ اس سے پہلے دادن کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ بابل خان کے ہوٹل میں موجود لوگوں نے اگر پنل کو نہ پکڑ لیا ہوتا تو وہ سرمد کی طرح دادن کو بھی جان سے مار ڈالتا۔ پھر اس نے ہماری اوطاق میں آ کر ہمارے منشی میرو کو بھی دھمکیاں دیں۔ اس کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ اب اسے پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“

بوڑھا حسین بخش بے چارہ کانپ اٹھا۔ لرزیدہ لہجے میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”سس۔۔۔سس۔۔۔سائیں وڈا! رحم۔۔۔رحم سائیں وڈا!!“

”اڑے بابا! یہ قانونی معاملہ ہے ہم کچھ نہیں کر سکتے؟“

”نہیں سائیں! آپ یہاں کے وڈے بھوتار ہو۔ تھانیدار حکم داد آپ کا دوست ہے۔ میرے بچے کو چھڑا دو سائیں! وہ قاتل نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر غریب رونے لگا۔ رئیس جابر خان نے اپنے قریب بیٹھے منشی میرو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور ہولے سے سر ہلاتے ہوئے رئیس جابر خان نے بالآخر ہاری حسین بخش سے کہا۔

”سنو حسین بخش! ہم ایک شرط پر تمہاری مدد کرنے کی کوشش کریں گے؟“

”حکم سائیں! حکم۔۔۔۔! مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔۔“ حسین بخش نے بے اختیار امید بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی بوڑھی غم زدہ آنکھوں میں ایکا ایکی آس کے چراغ جل اٹھے تھے۔ رئیس جابر خان نے کرکراتے لہجے میں کہا۔

”اگر تو اپنی دھی سوہنی کا بیاہ دادن سے کر دے تو تیرا پنل جیل سے چھوٹ سکتا ہے۔“ رئیس کی بات پر حسین بخش دم بہ خود رہ گیا۔ وہ بے بس اور مجبور تھا۔ پنل اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا۔ پھر وہ جلدی سے رضامند ہوتے ہوئے بولا۔

”سائیں! مجھے یہ شرط منظور ہے۔“ اس کی بات پر رئیس اور منشی نے ایک دوسرے کی طرف کامیاب مسکراہٹ سے دیکھا۔ پھر رئیس نے ہاری حسین بخش سے کہا

”جا پھر پہلے سوہنی کی دادن سے بیاہ کی تیاریاں کر! تیرا بیٹا پنل جلد چھوٹ کر واپس آ جائے گا، مگر اس سے پہلے تجھے سوہنی کو دادن کے ساتھ رخصت کرنا ہوگا ورنہ تیرا جوشیلا بیٹا پھر رنڈک ڈالنے کی کوشش کرے گا۔“

”برابر سائیں!۔۔۔برابر۔۔۔۔۔میں ابھی جاتا ہوں۔“ ہاری حسین بخش نے کہا اور سیدھا اپنے گھر پہنچا اور اپنی بیوی مائی مختاراں کو بھی یہ بات بتائی جب سوہنی نے یہ سنا تو وہ کانپ اٹھی۔

دادن جیسے رذیل اور بدہیبت بوڑھے سے شادی کا مطلب زندہ درگور ہونا

تھا۔اسے اپنے باپ سے بھی نفرت ہوگئی۔سرکشی تو پہلے ہی اس کی فطرت میں تھی۔اس نے نفرت سے سوچا کہ آخر ہر قربانی عورت کے حصے میں کیوں آتی ہے مگر میں خود کو قربانی کا بکرا ہرگز نہیں بناؤں گی۔یہ سوچ کر اس نے انتہائی فیصلہ کر ڈالا۔

یہ اس رات کا ذکر تھا۔ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔سوہنی نے گھر سے بھاگنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔نصف رات کے پہر میں سوہنی نے گھر سے قدم باہر نکالا اور بے سوچے سمجھے رات کی ظالم اور سفاک تاریکیوں کی گمنام راہی بن گئی۔دور آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔وہ لڑکی ہونے کے باوجود ایک مضبوط اعصاب اور آہنی عزائم والی سرکش لڑکی تھی۔اسے اپنے گوٹھ حتیٰ کہ اپنے لوگ، خود ساختہ وجاہلانہ رسم ورواجوں سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔فطرت میں تمرد اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔وہ ان سے پیچھا چھڑا کر نکل بھاگی تھی۔

اس نے سب سے پہلے پاس کے گوٹھ میں اپنی دور کے رشتے کی خالہ کے ہاں جانے کا قصد کیا تھا۔وہ بوڑھی عورت تھی۔اس کا نام زلیخاں تھا۔وہ بے اولاد تھی شوہر کا پچھلے دنوں کالے یرقان سے انتقال ہو چکا تھا۔سوہنی کو پورا یقین تھا کہ وہاں اسے پناہ مل سکتی ہے۔

اپنی خالہ زلیخاں کا گوٹھ زیادہ دور نہ تھا مگر راستے میں ایک مختصر سا قد آدم جھاڑیوں والا گنجان جنگل آتا تھا۔سوہنی کے اندر اس سے بڑا جنگل آباد تھا۔وہ بہ دستور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتی رہی۔آبادی پیچھے رہ گئی۔کھیتوں کا ویران اور تاریک سلسلہ شروع ہوگیا۔پھر وہ بھی پار ہوا۔سوہنی نے آوارہ کتوں کے ششکارنے کے لیے ٹہنی سی توڑ کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی۔اب سامنے قد آدم جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔وہ ایک لمحے کو رکی اور سامنے تاریک جھنڈ کو گھورتی رہی۔پھر دوسرے ہی لمحے وہ بے درنگ اندر داخل ہوگئی۔ذرا ہی آگے گئی ہوگی کہ اچانک دائیں طرف بہت سے گھوڑوں کی ہنہناتی آوازیں سنائی دیں۔وہ ڈر سی گئی۔پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ دوڑ لگا دی

دفعتاً اسے یوں لگا جیسے اس کے عقب میں بہت سے گھوڑے سرپٹ دوڑے آرہے ہیں مگر سوہنی نے دوڑنے کی رفتار ذرا بھی کم نہ کی۔آگے ایک خاصی مسطح قطعہ ارضی پر وہ بے دم ہو کر گر پڑی۔گھڑ سواروں نے شاید شفاف آسمان پر ٹکے ہوئے طباق چاند اور تاروں کی روشنی میں اس ویران جنگل میں ایک جوان لڑکی کو دیکھ لیا تھا۔

سوہنی بھربھری مٹی والی زمین پر لیٹی بری طرح ہانپ رہی تھی۔پھر اس کی متوحش آنکھوں نے ذرا فاصلے پر دس بارہ خوف ناک چہروں والے گھڑ سواروں کو دیکھا۔وہ سب مسلح افراد تھا۔ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔یہ بدنام صوبائی شہرت یافتہ دھاڑیل۔۔۔۔بکن دھاڑیل کا گروہ تھا جو خود بھی اس وقت اپنے ساتھیوں سمیت موجود تھا اور زمین پر نڈھال گری ہوئی سوہنی کو ہوس ناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

”اڑے۔۔۔۔۔خیرل! آج تو بڑا پکا پھل ہمارے ہاتھ لگا ہے۔چلو اٹھاؤ اسے اور لے چلو۔آ پڑیں جنگل ڈیرے پر۔“

لمبے تڑنگے گھڑ سوار بکن دھاڑیل نے حظ اٹھاتے لہجے میں اپنے ساتھی دھاڑیل خیرل سے کہا اور خبیثانہ مسکراہٹ سے متوحش سوہنی کو گھورنے لگا۔

دھاڑیل خیرل گروہ کا نمبر دو تھا۔دھاڑیل کے بعد وہی گروہ کی کمان سنبھالتا تھا۔بس پھر کیا تھا خیرل دھاڑیل نے آگے بڑھ کر سوہنی کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا۔سوہنی نے خوف سے چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔شیطانوں کا یہ گروہ طاغوتی قہقہے لگاتا ہوا اپنے جنگل ڈیرے کی طرف روانہ ہوگیا۔

سوہنی کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو خوف ناک چہروں والے خطرناک دھاڑیلوں کے درمیان پایا۔یہ جنگل بیچوں بیچ کا علاقہ تھا جو خطرناک صوبائی شہرت یافتہ بکن دھاڑیل کی خفیہ کمین تھی۔یہ سرکنڈوں کی ایک بڑی سی چھوالداری تھی جہاں سرغنہ بکن دھاڑیل اپنے نائب خیرل اور دو تین دھاڑیل ساتھیوں کے ساتھ فرش پر

نیم دائرے کی صورت میں بیٹھا تھا۔

وسط میں تھوڑے فاصلے پر سوہنی بے سدھ لیٹی تھی مگر ہوش میں آتے ہی وہ اٹھ بیٹھی تھی اور اب متوحش نگاہوں سے ان سب کے چہرے تکے جا رہی تھی۔

''اڑے یار سنگت خیرل! چھوکری تو یہ ڈاڈھی سونہڑیں ہے۔۔۔۔ کیا خیال ہے پھر۔۔۔؟'' معاً بکن دھاڑیل نے خبیثانہ مسکراہٹ سے پر ہوس لہجے میں سوہنی کو گھورتے ہوئے خیرل سے کہا تو بے چاری سوہنی اس کی معنی خیز ادھوری بات کا شیطانی مقصد سمجھ کر لرز اٹھی۔ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر روہانسے لہجے میں بولی۔

''مم۔۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہوں۔''

''ہاہاہا ٹھیک ہے پھر ہم جو ہیں تمہارا سہارا بننے کے لیے۔''

بکن دھاڑیل نے بھنویں اچکاتے ہوئے شیطانیت سے کہا۔ اس کے ساتھیوں نے واشگاف قہقہہ لگایا، البتہ بکن دھاڑیل کا نائب خیرل جس کا پورا نام دھاریل خیرل سندھو تھا۔ چپ بیٹھا ڈری سہمی سوہنی کو تکے جا رہا تھا۔

''نن۔۔۔۔ نہیں۔ مجھ پر یہ ظلم نہ کر۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں مم۔۔۔ مجھے جانے دو۔'' یہ کہہ کر سوہنی پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ باہر رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ اندر ایک کونے میں بدہیت بانس کے ساتھ لالٹین جھول رہی تھی۔

سوہنی کے اٹھتے ہی بکن دھاڑیل نے درشت لہجے میں غراتے ہوئے اس سے کہا۔

''بیٹھ جاؤ۔۔۔۔ چھوکری! ایسا نہ ہو وقت سے پہلے ہی ہم تیری مٹی پلید کر دیں۔ تجھے آج رات ہماری ملکہ بننا ہوگا۔ آج رات ہم تیرے ساتھ جشن منائیں گے۔۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا۔'' اس کی دیکھا دیکھی اس کے ساتھیوں نے بھی شیطانی قہقہے لگانا شروع کر دیے اور تب سوہنی نے جیسے ابلیس صفت سرغنہ بکن

دھاڑیل کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی ہوس کو بھانپ لیا اور پھر اس کی فطری سرکشی بیدار ہونے لگی۔ اس نے دوسرے ہی لمحے اپنے ڈر و خوف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بکن دھاڑیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''اے شیطان! اللہ سائیں کے عذاب سے ڈر!۔۔۔ ایک بے بس اور مجبور لڑکی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے تجھے شرم آنی چاہیے۔ لعنت ہے تیری مردانگی پر اور تیرے لمبے چوڑے وجود پر۔''

گوٹھ کی ایک سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی لڑکی کے للکارنے پر ایک لمحے کو تو بکن دھاڑیل جیسا سفاک شیطان دم بہ خود رہ گیا۔ پھر جیسے دوسرے ہی لمحے اس کی خوف ناک آنکھوں میں درندگی کی چمک عود کر آئی اور وہ غصے سے غرا کر اٹھا پھر آگے بڑھتے ہوئے سوہنی کو بالوں سے پکڑ کر اس کی نازک صراحی دار گردن کو جھٹکا دیا تو سوہنی کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ سی نکل گئی۔

''سور کی بچی! ابھی تجھے اپنی مردانگی دکھاتا ہوں۔'' بکن دھاڑیل نے خونخوار لہجے میں کہا اور پھر وہاں موجود سوائے اپنے نائب خیرل سندھو کے سب کو باہر نکل جانے کا اشارہ کیا پھر سب کے جاتے ہی بکن دھاڑیل پر ہوس نظروں سے سوہنی کے روتے بلکتے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے سر سے اجرک کی چادر کھینچ لی دھاڑیل خیرل سندھو بظاہر خاموش کھڑا تھا مگر اس کے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سوہنی نے بے بس اور رحم طلب نگاہوں سے بکن دھاڑیل کے خونخوار چہرے کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر اپنے دونوں کپکپاتے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

''تیرے کو اللہ سائیں کا واسطہ! مجھ غریب ناری پر یہ ظلم نہ کر!''

مگر بکن دھاڑیل پر اس وقت شیطان سوار تھا۔ اس نے اپنی روسی ساختہ اے کے ۴۷ کلاشنکوف ایک طرف پھینکی اور سوہنی کے گریبان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا

ہی تھا کہ اچانک اس کے نائب اور گروہ کے نمبر دو سرغنہ دھاڑیل خیرل سندھو نے گونج دار آواز میں اپنے سرغنہ بکن دھاڑیل سے کہا۔

''سائیں وڈا! اس چھوکری کو چھوڑ دو!'' اس کی آنکھوں میں غیرت و جوش کی چمک کو سوہنی نے پڑھ لیا تھا۔ بکن دھاڑیل کا اس کے گریبان کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ یک لخت رک گیا۔ وہ ایک لمحے کو بت بنا کھڑا رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نائب اسے روکنے کی جرأت بھی کر سکتا ہے۔ اس نے سوہنی کو چھوڑ کر اپنے نائب دھاڑیل خیرل سندھو کی طرف سنسناتی نظروں سے دیکھا پھر سناٹے دار لہجے میں اس سے بولا۔

''خیرل! تو کب سے نامرد بن گیا ہے ڑے!''

''سردار سائیں! ایک مجبور اور بے بس لڑکی کی عزت خراب کرنا کہاں کی مردانگی ہے؟'' دھاڑیل خیرل سندھو نے غیرت بھرے لہجے میں اپنے سردار بکن دھاڑیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا تو بکن دھاڑیل غصے سے پھنکار کر بولا۔

''یہ کیا بکواس کر رہا ہے ڑے خیرل! جانتا نہیں میں گروہ کا سردار ہوں۔''

''مگر میں تجھے ایک بے بس لڑکی کے ساتھ ایسا شرمناک کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔'' یہ کہہ کر دھاڑیل خیرل سندھو آگے بڑھا اور زمین پر پڑی اجرک اٹھا کر سوہنی کے سر پر ڈھانپ دی۔

''اسے جانے دے سردار! اسے جانے دے!'' اس کے لہجے میں عجیب دبدبہ عود کر آیا۔

مگر بکن دھاڑ کر بولا۔ ''ہرگز نہیں! یہ میرا شکار ہے اور اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ میرے گروہ سے نکل جا!''

یہ کہہ کر اس نے سوہنی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دھاڑیل خیرل سندھو ایک دم

سوہنی کی ڈھال بن گیا۔ دونوں دھاڑیل آمنے سامنے تھے۔ دونوں ہی لمبے تڑنگے اور تحیم شحیم تھے۔ تب بکن دھاڑیل نے ایک زوردار گھونسا خیرل سندھو کے جبڑے پر جڑ دیا۔ خیرل نے تکلیف کی پرواہ کیے بغیر اپنی لات چلا دی۔ بکن دھاڑیل چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ پھر وہ جیسے ہی زمین پر پڑی اپنی کلاشنکوف اٹھانے بڑھا تو خیرل سندھو نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ سوہنی سراسیمہ انداز میں ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی اور دل ہی دل میں اس بھلے مانس دھاڑیل خیرل سندھو کی فتح کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سوہنی کو کسی غیرت مند مرد پر فخر محسوس ہو رہا تھا جو اس کے لیے لڑ رہا تھا جو اس کی عزت بچانے کے لیے اپنے سرغنہ سے جا بھڑا تھا۔ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر۔۔۔۔۔۔اپنی جان اس کی خاطر جوکھم میں ڈال دی تھی۔ پھر ایک موقع پر اس نے دیکھا کہ شیطان صفت بکن نے کلاشنکوف اپنے قبضے میں کر لی۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ خیرل سندھو نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور زمین پر لوٹ لگاتا ہوا سیدھا بکن دھاڑیل کے پیروں سے ٹکرایا۔ بکن دھاڑیل لڑکھڑایا۔ خیرل سندھو نے اس کی قدموں میں لیٹے لیٹے اپنی ٹانگ اس کی رائفل والے ہاتھ پر رسید کر دی۔ نتیجتاً رائفل بکن دھاڑیل کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ خیرل سندھو نے بکن دھاڑیل کو مزید سنبھلنے کا موقع دیے بغیر دوسری لات اس کے پیٹ پر بھی جڑ دی اور بہ سرعت لوٹ لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ بہت خطرناک صورت حال تھی اور کسی ایک کی ہلاکت پر منتج ہو سکتی تھی دونوں ایک دوسرے سے رائفل چھیننے کے لیے اپنے پہاڑ جیسے وجود کی طاقت صرف کر رہے تھے۔ پھر بکن دھاڑیل نے اچانک خیرل سندھو کے پہلو پر اپنا گھٹنا جڑ دیا۔

اذیت کی ایک طوفانی لہر پورے وجود میں سرایت کرتی چلی گئی۔ رائفل پر ذرا گرفت ڈھیلی پڑی۔ بکن دھاڑیل نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس

سے رائفل چھیننی چاہی تو خیرل سندھو نے جھٹکے سے اپنی تکلیف کا بدلہ اپنے سر کی بھرپور ضرب اس کی ناک پر مار کر لیا۔ جو خاصی نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ بکن دھاڑیل کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ خیرل سندھو نے جھٹکے سے رائفل چھین لی اور اس کا رخ بکن دھاڑیل کی طرف کر دیا۔ بکن دھاڑیل کی آنکھوں کے سامنے موت کی زرد چمک لہرائی۔ خیرل سندھو نے اس شیطان کو ہلاک کر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بصورت دیگر وہ سوہنی کو نہیں چھوڑتا چنانچہ اس نے لبلبی رہا کر دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نکلی اور بکن دھاڑیل کا سینہ گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ سوہنی دہشت زدہ ہو گئی۔ گولیوں کی آواز سن کر دوسرے دھاڑیل بھی اندر آ گئے۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے انہیں لاش اٹھانے کا حکم دیا۔ پھر باہر آ کر سرداری کا اعلان کر دیا۔

اس نے سرداری کا اعلان کرتے ہوئے پہلے ایک تقریر کر کے گروہ کے لوگوں کو بتایا کہ دھاڑیل بکن نے گروہ کے اصولوں کے خلاف قدم اٹھایا تھا اور ایک مجبور و بے بس لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ یوں تو دھاڑیل خیرل سندھو کے گروہ میں حمایتیوں کی تعداد کم تھی مگر ان میں ایک دھاڑیل جانو جگری بھی تھا۔ وہ ایک کینہ پرور اور مار آستین شخص تھا۔ اس نے نئے سردار خیرل سندھو کو دل سے گروہ کا سرغنہ نہیں مانا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ سابقہ دھاڑیل خیرل سندھو کا خیر خواہ تھا بلکہ دھاڑیل جانو جگری سرداری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اونٹ کی طرح کینہ اپنی ناف میں چھپائے سر دست خاموش ہی رہا تھا مگر اب وہ موقع کی تاک میں تھا کہ وہ نئے سردار دھاڑیل خیرل سندھو کو ایک کینہ پرور اونٹ کی طرح اپنی چکی جیسی بھاری ناف تلے کچلتا ہے۔ بہر طور سرداری وغیرہ کا معاملہ نمٹانے کے بعد دھاڑیل خیرل سندھو الم نصیب سوہنی کی طرف متوجہ ہوا۔

''تیرا نام کیا ہے؟''

''سس۔۔۔ سوہنی!'' اس نے مرتعش سی آواز میں اپنا نام بتایا۔

''کون ہے تو۔۔۔؟''

''میں۔۔۔ میں ایک گریب ہاری کی بیٹی ہوں۔''

''رات کے وقت تو کدھر بھاگ رہی تھی؟''

''وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا باپ مجھے وڈیرے کے دباؤ میں آ کر ایک بوڑھے سے میری شادی کرنا چاہتا تھا اور میں بھاگ کر اپنی خالہ کے ہاں جا رہی تھی؟''

''ہوں! یہ واقعی تیرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔'' دھاڑیل خیرل سندھو نے متاثر کن لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سوہنی اسے مدد طلب نگاہوں سے تکنے لگی۔ وہ بولا۔

''مگر تیری خالہ تیرا تحفظ کیسے کرے گی؟ وڈیرے کے آدمی وہاں بھی تو پہنچ سکتے ہیں؟''

''اللہ کے آسرے پر یا کسی نیک اور بہادر انسان کی مدد پر۔''

سوہنی نے اس بار صاف گوئی سے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں دونوں کے دلوں کے تارے بج اٹھے اور پھر سوہنی نے بے اختیار اپنا سر جھکا لیا۔

دھاڑیل خیرل سندھو کو یہ معصوم سی پیاری لڑکی بہت بھائی تھی۔ پھر اس نے کسی خیال کے تحت جاننا چاہا اور گھمبیر آواز میں بولا۔

''مجھے تو کیسا انسان سمجھتی ہے؟'' اس کے اسرار بھرے استفسار پر سوہنی نے ذرا چونک کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر یک دم ہی نگاہیں جھکا لیں۔

''مجھ سے شادی کرے گی۔۔۔؟'' اچانک خیرل سندھو نے اس کا عندیہ لیا تو سوہنی کے تفتہ دل کے تار بج اٹھے۔ اسے یہ بانکا سجیلا نوجوان اچھا لگا تھا وہ تھا تو دھاڑیل مگر سوہنی کو اس کی شرافت اور بہادری نے از حد متاثر کیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر رضامندی کے اظہار کے طور پر اپنا سر جھکا لیا۔

''سوچ لے چھوکری! میں ایک دھاڑیل ہوں۔ کیا تو ایک ڈاکو کی بیوی بننا پسند کرے گی؟'' دھاڑیل خیرل سندھو نے پھر پوچھا تو سوہنی اس کی طرف دیکھ کر بولی

''تو یہ دھندا چھوڑ کر شرافت کی روزی کیوں نہیں کماتا۔۔۔۔؟''

اس کی بات پر دھاڑیل خیرل سندھو کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ عود کر آئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

''سوہنی! میں نے بھی شرافت کی زندگی اور محنت کی کمائی سے روزی روٹی کمانے کی کوشش کی تھی مگر مجھے بھی ایک عام ہاری سے خطرناک دھاڑیل بنانے میں انہی مظالم وڈیروں کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے میری معصوم بہن کو خوار کیا۔ اس بے چاری نے دل برداشتہ ہو کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میرے بوڑھے ہاری ماں باپ کو گھر سمیت زندہ جلا دیا گیا اور جب میں نے انصاف کا دروازہ کھٹکھٹایا تو قانون کے رکھوالوں نے جو آئے روز وڈیرے کی اوطاق میں بھٹ تیتروں کے سالم بھنے ہوئے پھٹور کی ضیافت اڑاتے، شرابیں پیتے، جشن پارٹیں کرتے، الٹا انہوں نے ہی مجھے گرفتار کر لیا اور یوں ظلم اور ناانصافی کے پاٹوں کی اس سفاک چکی میں پس کر میری زندگی کا ڈھب ہی بدل کر رہ گیا۔'' دھاڑیل خیرل سندھو اپنی ماضی کی مختصر درد آگیں کتھا سنانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اپنے ماضی کی غیرت سوز داستان بیان کرنے کے بعد اس کے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ سوہنی کو ایسے میں وہ ایک خطرناک دھاڑیل کی بجائے ایک الم نصیب اور دکھی انسان معلوم ہو رہا تھا جس نے اسے بھی متاثر کیا تھا وہ آگے بڑھی اور اس زخم خوردہ انسان کا گویا مرہم بن کر اس سے چمٹ گئی۔ دو یک جان دو قالب میں ڈھل گئے۔

پھر سوہنی نے بھی اسے اپنی ساری رام کہانی سنا دی کہ کس طرح اس کے غیرت مند بھائی محمد پنل کو سرمد کے جھوٹے قتل کے الزام میں دادن اور منشی میرو نے ملی بھگت کر کے رئیس جابر خان کے ذریعے گرفتار کروایا تھا اور متعلقہ تھانے کا حوالدار حکم

دادپنل کو لمبی سزا میں پھنسانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دھاڑیل خیرل سندھو اس کی رام کتھا پر غصے سے دانت پیس کر بولا۔

''اس کا مطلب ہے اب ایک اور شریف انسان دھاڑیل بنایا جا رہا ہے سوہنی! تیرا غم بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے تو بے فکر رہ۔ میں نے غریبوں کو لوٹنے کے لیے بلکہ ایسے ظالموں کو سبق سکھانے کے لیے یہ روپ بھرا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور شاید ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بھی۔''

☆......☆......☆

دونوں کی کہانی ایک تھی اور دونوں کے زخموں کی نوعیت بھی۔

حالات دگرگوں نے دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی صورت ملا دیا تھا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے سوہنی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی ضرور مدد کرے گا اور جن لوگوں نے اسے راندہ درگاہ کرنے کی کوشش کی ہے ان کا عرصہ حیات تنگ کر دے گا۔

چنانچہ ایک رات دھاڑیل خیرل سندھو نے اپنے گروہ کے پندرہ ساتھیوں کو گوٹھ کے متعلقہ تھانے میں شب خون مارنے کے لیے تیار کیا۔ تیز رفتار گھوڑوں پر یہ لوگ روانہ ہو گئے۔ سوہنی جنگل ڈیرے ہی میں موجود تھی۔ وہ خیرل سندھو کے کامیاب لوٹنے کی دعائیں مانگنے لگی۔

اپنے سردار دھاڑیل خیرل سندھو کی ہونے والی بیوی کی حیثیت سے گروہ کے لوگ سوہنی کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے اور اسے سردار ہی کی چھوالداری میں رکھا ہوا تھا اور خود اپنے سردار خیرل سندھو اور ساتھیوں کی آمد کے منتظر تھے۔ وہ وہیں دو دو تین تین کی ٹولیاں بنائے بیٹھے آپس میں گفتگو میں مصروف تھے کچھ جنگل ڈیرے کی سرحد پر بہ طور پہرے داری کے متعین تھے۔ رات نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ تاروں بھرا آسمان روشن تھا۔ آخری تاریخوں کا چاند کہیں دور جھکا ہوا تھا۔ ایک الگ تھلگ گوشے میں مار آستین دھاڑیل جانو جگری اپنے چند ہم خیال

ساتھیوں کو سردار دھاڑیل خیرل سندھو کے خلاف ورغلانے میں مصروف تھا۔

"خیرل سندھو نے ایک دو ٹکے کی چھوکری کی خاطر ہمارے سردار بکن دھاڑیل کو موت کے گھاٹ اتار کر اچھا نہیں کیا ہے۔" وہ سرسراتی سرگوشی میں اپنے ساتھیوں کے مختصر ٹولے سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہم پر اپنے سردار کا قرض ہے کہ ہم اپنا فرض نبھائیں۔"

"مگر جانو سائیں! اب کیا ہو سکتا ہے؟ خیرل سندھو تو اب گروہ کا سردار بن چکا ہے؟" اس کے حامی نے رائے طلب لہجے میں ہولے سے کہا۔

"اڑے بابا تم لوگ ذرا ہمت تو کرو۔۔۔اور میرا ساتھ دو پھر دیکھو! میں کس طرح خیرل سندھو سے اپنے سردار بکن کا بدلہ لیتا ہوں۔" دھاڑیل جانو جگری نے مکاری سے کہا تو ایک دوسرا حمایتی بولا۔

"جانو سائیں! ہماری تو حیثیت گروہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہے سبھی اسے سردار تسلیم کر چکے ہیں۔"

وقت آنے دو۔" جانو جگری زہریلے لہجے میں سرسرایا۔

"تم فی الحال ایک کام کرو۔ آہستہ آہستہ گروہ کے دیگر لوگوں کے دلوں میں خیرل سندھو کے خلاف نفرت کا زہر بھرو۔ ایک بار میں گروہ کا سردار بن گیا تو میں اس حسین شہزادی سوہنی کو اپنے قبضے میں کر لوں گا۔ میرا دل بڑا ہے۔ پھر وہ گروہ کے ہر ساتھی کی روزانہ رانی بنے گی۔ میں تو مل بیٹھ کر کھانے والا ہوں بابا!"

جانو جگری نے شیطانیت سے بھرپور لہجے میں کہا۔ باقی لوگوں کے دلوں میں سوہنی جیسی حسین شہزادی کو ایک رات کی رانی کے تصور سے بجلیاں کوندنے لگیں۔ ادھر بے چاری سوہنی اس زہرناک حقیقت سے بے خبر نازاں وشاداں اپنی چھولداری میں بیٹھی تھی کہ جانو جگری جیسا ایک شیطان اس کے اور اس کے ہونے والے شوہر خیرل سندھو کے خلاف کسی مذموم سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف

ہے۔

☆......☆......☆

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ باہر سناٹا بھی چیختا ہوا محسوس ہو رہا تھا تھانے کی مختصر اور سالخوردہ عمارت پر گہرا سکوت طاری تھا۔ گنی چنی چند سلاخ والی کوٹھریوں میں قیدی پڑے اونگھ رہے تھے۔ انہی میں بدنصیب اور حالات زدہ محمد پنل بھی موجود تھا۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ جیل کی تنگ و تاریک سیلن زدہ کوٹھری میں اکھڑے ہوئے ننگی اینٹوں والے فرش پر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا اپنی تقدیر کو رو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار دادن کا چہرہ ابھر رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا۔ اسے ساتھ ہی تھانیدار حکم داد پر بھی طیش آ رہا تھا جس نے سرمد کے قتل کے جھوٹے الزام میں اسے داخل زنداں کر دیا تھا۔ پنل کو دادن اور منشی میرو کی سازش کا اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ دادن نے منشی میرو اور رئیس جابر خان کے ساتھ ملی بھگت کر کے اسے پہلے تھانے پھنسوا کر اپنا راستہ صاف کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ رئیس ہی کی مدد سے اس کے بوڑھے ماں باپ پر دباؤ ڈال کر اس کی معصوم بہن سوہنی کا سنگ (رشتہ) حاصل کرنا چاہتا تھا۔ محمد پنل کا دماغ ان ژولیدہ حالات تلے بری طرح جلنے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ لاک اپ کی آہنی سلاخوں کو توڑ کر سیدھا دادن کے پاس پہنچے اور اس کا نرخرہ چبا ڈالے۔

"چلو باہر آؤ۔" اس میں سے ایک نے سلاخ دار دروازہ کھول کر کرخت لہجے میں اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ پنل حیران و پریشان تھا کہ اسے اس وقت کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ ایک لمحے کو تو وہ اس خیال سے لرز اٹھا کہ کہیں اسے دانستہ فرار کا موقع دے کر پولیس مقابلے کی صورت میں قتل تو نہیں کیا جانے والا تھا۔ بہر طور پر وہ گرداب خیالات کو جھٹکتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں سپاہی اسے خاموشی کے ساتھ حوالدار حکم داد کے کمرے میں لے آئے۔

کمرے میں بلب روشن تھا۔سامنے میز کرسی پر حوالدار حکم داد اپنی دونوں ٹانگیں میز پر پسارے بیٹھا اس کی طرف سنسناتی نظروں سے گھور رہا تھا۔محمد پنل کو اپنے وجود میں پھریری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔اس کے بعد حکم داد بہ دستور اسے گھورتا ہوا کرسی سے اٹھا اور پنل کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔پھر اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔پنل صرف پانچ جماعت پڑھا ہوا تھا مگر کاغذ پر اس تحریر کو پڑھ سکتا تھا۔حوالدار حکم داد نے وہ کاغذ اس کی طرف بڑھایا اور کرخت لہجے میں بولا۔

''تو انگوٹھا لگاتا ہے یا دستخط کرتا ہے؟''

''مجھے نام لکھنا آتا ہے اپنا۔'' محمد پنل نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''چل پھر اس پر اپنا نام لکھ کر انگوٹھا بھی لگا دے۔'' حوالدار حکم داد نے جیب سے قلم بھی نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔پنل الجھتی ہوئی نظروں سے کاغذ کو دیکھتے ہوئے اسے لے کر پڑھنے لگا تو اس کی کنپٹیوں پر سائیں سائیں ہونے لگیں۔وہ اس کی طرف سے لکھا ہوا خود ساختہ بیان تھا جس کی رو سے محمد پنل نے واقعی اپنے چچا زاد سرمد کا خون اس لیے کیا تھا کہ اس نے اس کی بہن سوہنی سے منگنی توڑ دی تھی۔

''میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔یہ جھوٹا بیان ہے۔میں نے سرمد کا قتل نہیں کیا۔۔۔۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ حوالدار حکم داد کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور ایک چٹاخ کی بلند آواز کمرے میں گونجی۔پنل اس کا بھاری بھرکم تھپڑ کھا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔اس کا بایاں گال سرخ ہو گیا تھا۔پنل نے مارے طیش کے دانت بھینچ لیے۔حوالدار حکم داد جلاد صفت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔

''اڑے او چھوکرا!۔۔۔۔شرافت سے اس کاغذ پر انگوٹھا لگا دے اپنا ورنہ!۔۔۔۔لتر مار مار کر کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔'' اس کے غراتے ہوئے لہجے میں سفاک تہدید تھی۔

''ہرگز نہیں!یہ جھوٹا بیان ہے؟'' پنل اپنی بات پر اڑ گیا۔

حوالدار حکم داد نے سنسناتی ہوئی نظروں سے اسے گھورا پھر ہونٹ چبا کر بولا۔

''دیکھو پنل!تو اپنا جرم مانے گا تو تیری سزا کم ہو جائے گی اور تو مار سے بھی بچ جائے گا۔اس لیے چمڑی ادھڑنے سے پہلے میری بات مان لے۔'' پنل اسکی مکاری سمجھ گیا تھا لہٰذا بدستور ہٹیلے لہجے میں بولا۔

''مگر میں نے سرمد کا قتل کیا ہی نہیں ہے پھر کیوں میں اس جھوٹے بیان پر اپنا انگوٹھا لگاؤں؟'' اس کے حتمی انداز میں انکار پر حوالدار حکم داد نے قلم اپنی جیب میں رکھا۔کاغذ لپیٹ کر اپنی قمیض کی جیب میں رکھا،اس کے بعد وہاں کھڑے دو سپاہیوں میں سے ایک کو تحکمانہ کہا۔

''اڑے جا بشیر!ذرا بارہ نمبر کا لتر اور کڑوے تیل کی بوتل لے کر آ۔۔۔جا بابا جا تکڑا۔۔۔۔۔شاباش۔'' بشیر نامی سپاہی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مودبانہ انداز میں سیلوٹ مارتا ہوا نکل گیا۔پنل کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ اب یہ خبیث اپنی مرضی کے بیان پر انگوٹھا نہ لگانے کی اسے انسانیت سوز سزا سے دوچار کرنے والا تھا۔دفعتاً تھانے کی عمارت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔یہ لوگ بری طرح چونک پڑے۔حوالدار حکم داد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دوسرے ہی لمحے کمرے میں چار پانچ ڈھاٹا پوش دھاڑیل داخل ہوئے ان میں دھاڑیل خیرل سندھو بھی تھا۔اس نے ایک مخنی سے سپاہی کی گردن دبوچ رکھی تھی اسے حوالدار حکم داد کے قدموں میں پٹخا اور سب نے حوالدار حکم داد پر اپنی کلاشنکوفیں تھام لیں۔خیرل سندھو غرا کر حوالدار سے بولا۔

''کوئی غلط حرکت نہیں چلے گی ہمارے ساتھیوں نے پورے تھانے کو گھیر رکھا ہے۔محمد پنل کہاں ہے؟''

محمد پنل نے اپنا نام ایک اجنبی سے سنا اور چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

حوالدار حکم داد بری طرح سے پریشان اور متوحش نظر آ رہا تھا۔ اس نے بالآخر قریب کھڑے پنل کی طرف اشارہ کیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے پنل کے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔

"آؤ سنگت! تیری بہن سوہنی تیرا انتظار کر رہی ہے۔"

محمد پنل بری طرح چونکا۔ خیرل سندھو اسے لے کر باہر آ گیا۔ ہر طرف دھاڑیل پھیلے ہوئے تھے جنہوں نے پولیس والوں کو نہتا کر رکھا تھا اور اپنی گن پوائنٹ پر آن لیا تھا۔ آن واحد میں یہ لوگ پنل کو لے کر اپنے گھوڑوں پر بیٹھے ۔۔۔اور رفو چکر ہو گئے۔

☆......☆......☆

جنگل ڈیرے پر سناٹا طاری تھا۔ سوہنی، دھاڑیل خیرل سندھو کے انتظار میں اس کی چھوالداری میں موجود تھی اور دعائیں مانگ رہی تھی کہ اس کا بھائی محمد پنل خیریت کے ساتھ جلد لوٹ آئے۔ خاصی دیر بعد جب مشرقی افق پر سپیدہ نمودار ہوا تو اسے باہر اچانک شور سنائی دیا۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور وہ بے تابانہ انداز میں اٹھ کر چھوالداری سے باہر نکل آئی تو سامنے نیم اجالے میں اس نے دیکھا کہ خیرل سندھو کے ساتھ اس کا بھائی محمد پنل بھی اس کے گھوڑے سے نیچے اتر رہا تھا سوہنی اپنے بھائی کو دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ وہ بے اختیار از راہِ مسرت "ادا پنل" کہتی ہوئی اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ پنل بے چارہ اپنی معصوم بہن کو ان خطرناک دھاڑیلوں (ڈاکوؤں) کے درمیان دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے دونوں کو چھوالداری میں آنے کا کہا پھر اندر آ کر دھاڑیل خیرل سندھو نے محمد پنل کو اس کی بہن سوہنی سے متعلق ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ محمد پنل یہ سن کر سناٹے میں آ گیا پھر دانت بھینچ کر غصے سے بڑبڑایا۔

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ مجھے سوچی سمجھی سازش کے تحت ہی اس جھوٹے کیس میں پھنسوایا گیا تھا تا کہ اس خبیث کتے دادن کا راستہ صاف ہو جائے اور وہ رئیس کے ذریعے میرے ماں پیو (باپ) پر دباؤ ڈال سکے۔"

پھر اس نے دھاڑیل خیرل سندھو کا شکریہ ادا کیا اور پھر اسے بھی حوالدار حکم داد کے بارے میں بتایا کہ کس طرح اس سے ایک خودساختہ بیان والے لکھے گئے کاغذ پر زبردستی اس کا انگوٹھا لگوانا چاہتا تھا۔ سوہنی اور دھاڑیل خیرل سندھو بھی اس کی مختصراً کتھا سن کر دم بخود رہ گئے تھے پھر دھاڑیل خیرل سندھو غراہٹ آمیز انداز میں بڑبڑایا۔

"حوالدار حکم داد۔۔۔۔ لگتا ہے رئیس کا رتب خوار بن چکا ہے۔ خیر! اب تم کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ حکم داد سمجھ گیا. گا کہ تو کس کا آدمی ہے؟"

اس وقت ہلکے پھلکے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ تینوں وہیں چھوالداری میں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ سارا دن دونوں بہن بھائی جنگل ڈیرے پر ہی موجود رہے پنل اپنے گھر جانا چاہتا تھا مگر دوبارہ گرفتاری کے خوف سے اس کی ہمت نہ کر سکا البتہ اس نے اپنی بہن سوہنی کو سمجھایا کہ کم از کم وہ تو گھر چلی جائے لیکن سوہنی نے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر گھر گئی تو دادن سے اس کی زبردستی شادی کر دی جائے گی۔ پنل اس کی بات پر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے بھی مشورہ دیا کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے انہیں انہی کے پاس رہنا چاہیے۔ چنانچہ پنل نے کچھ روز ادھر ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مردم گزیدہ دھاڑیل خیرل سندھو کا شکر گزار تھا۔

یہ اس دن بعد دوپہر کا ذکر تھا۔ ایک مخبر اللہ بچایو نے آ کر ایک چونکا دینے والی اطلاع دی۔ اس نے ہانپتے ہوئے بتایا کہ پولیس پنل کے سارے خاندان کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہے۔ اس کی بیوی ریشماں اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ پنل نے

یہ سنا تو مارے طیش کے لرز اٹھا۔

"میں اس خبیث انسپکٹر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اڑے بابا سنگت (دوست) حوالدار حکم داد کو رئیس کی پشت پناہی حاصل ہے۔ان لوگوں کو ہم سب مل کر اچھی طرح مزہ چکھائیں گے۔" دھاڑیل خیرل سندھو نے زہر خند لہجے میں کہا تو محمد پنل کسی مخدوش خیال کے تحت بولا۔

"بھا خیرل! وہ کتا حوالدار میرے ماں پیو کو پریشان کر سکتا ہے۔"

"اس کی اب ہمت نہیں پڑے گی۔یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" خیرل سندھو معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

اس کا خیال اپنی جگہ درست تھا مگر اگلے دن ہی ان تینوں کو ایک الگ ہی واقع کی اطلاع ملی۔دھاڑیل خیرل سندھو کے ایک مخبر ساتھی نے یہ لرزہ خیز اطلاع دی کہ رئیس نے پنل کے بیوی بچوں اور بوڑھے ماں باپ کو نجی جیل میں قید کر دیا ہے۔

اس اطلاع پر تینوں سناٹے میں آ گئے۔پنل کے اندر آتش فشاں کھولنے لگا سوہنی بری طرح دہل گئی۔دھاڑیل خیرل سندھو کے چہرے پر ازلی درشتی کھنڈ آئی۔

"میں اس بدبخت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" پنل نے غلیظ آلود لہجے میں کپکپاتے ہوئے کہا تو دھاڑیل خیرل سندھو نے اس کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

"سنگت! ہم تیرے ساتھ ہیں۔آج رات رئیس سے بھی نمٹ لیتے ہیں۔"

یہ خبر اس کے مارِ آستین اور سازشی ساتھی دھاڑیل جانو جگری سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔اسے جیسے ہی یہ پتا چلا کہ سردار دھاڑیل خیرل سندھو اور پنل اپنے ساتھیوں سمیت رئیس کی حویلی میں شب خون مارنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے تو فوراً اُسے گل کھلانے کا موقع مل گیا۔اس نے اسی وقت درپردہ پولیس مخبر ساتھی کے ساتھ رئیس کی کارپردازی نبھاتے ہوئے اپنے ایک قابل اعتماد مخبر ساتھی کے ذریعے

پہلے متعلقہ تھانے کے حوالدار حکم داد کو یہ خفیہ اطلاع پہنچائی جو اس نے فوراً رئیس کے بھی گوش گزار کر دی۔بس پھر کیا تھا۔حوالدار حکم داد پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ ہی رئیس کے مسلح آدمی بھی چوکنا ہو گئے۔

ادھر دھاڑیل خیرل سندھو اور محمد پنل اس سازش سے غافل تھے۔جیسے ہی رات سر پر پہنچی اور چہار سو اندھیاروں کا راج ہوا تو دھاڑیل خیرل سندھو نے اپنے الگ تھلگ سولہ مسلح دھاڑیل ساتھیوں کی کھیپ تیار کی۔اس نے پنل کو اپنے ساتھ جانے سے روکنا چاہا مگر جب وہ نہ مانا تو اس نے مجبوراً اسے بھی ایک عدد رائفل تھمادی پھر یہ لوگ سب سبک رفتار گھوڑوں پر جنگل ڈیرے سے روانہ ہو گئے۔مارِ آستین جانو جگری ان کے روانہ ہوتے ہی مکاری سے مسکرانے لگا۔اگرچہ دھاڑیل خیرل سندھو نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا مگر بڑی عیاری سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر جنگل ڈیرے پر ہی رک گیا تھا۔اس کے ہم خیال ساتھی بھی جنگل ڈیرے پر ہی اپنے دوسرے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ وہیں موجود رہے تھے۔

سازشی جانو جگری اب تصور میں پنل اور سردار خیرل سندھو کو سلاخوں کے پیچھے یا خون آلود لاشوں کی صورت دیکھ کر دل ہی دل میں بڑا خوش ہو رہا تھا اور ساتھ ہی سوہنی کو بھی اپنی رانی بنانے کے خوش کن تصور میں خوشی سے جھوم رہا تھا۔اس کی شیطانی نظریں سوہنی پر کب سے تھیں۔آج اسے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خوب موقع ملا تھا۔

ادھر بے چاری الم نصیب سوہنی کو کیا علم تھا کہ اس پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔دھاڑیوں کے اس خطرناک گروہ کے ساتھ رہتے ہوئے اسے اگرچہ چند روز ہی ہوئے مگر اسے رائفل اٹھانی آ گئی تھی۔وہ اسے چلا بھی لیتی تھی مگر نشانہ ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا۔اپنی حفاظت کیلئے اس وقت بھی دھاڑیل خیرل سندھو نے اسے حفظِ ماتقدم کے تحت ایک عدد رائفل دے رکھی تھی۔وہ اپنی چھوالداری میں تنہا موجود تھی۔

ادھر دھاڑیل جانو جگری نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ایک بار پھر اپنے ہم خیال ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور اس وقت جنگل ڈیرے میں موجود دھاڑیل خیرل سندھو کے آدمیوں کی تعداد سے متعلق پوچھا۔

ہاکو نامی اس کے ایک ہم خیال ساتھی نے اسے سرگوشی میں بتایا۔

"جانو سائیں! موقع اچھا ہے۔ اس وقت جنگل ڈیرے میں ہمارے حمایتی ساتھیوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ چند گنے چنے سردار کے حامی یہاں ہوں گے باقی تو سمجھو سردار خیرل کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے۔"

فتح کے جوش سے جانو جگری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پھر سفاکانہ لہجے میں ہونٹ سکیڑ کر بولا۔

"چلو پھر اس وقت ان چند دشمنوں کو بھی خاموشی سے موت کے گھاٹ اتار دو۔ میں ذرا اس حور پری سوہنی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہوں جا کر۔"

یہ کہہ کر اس کے ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ظلم و بربریت کا کھیل شروع ہو گیا۔ سوہنی شیطان خصلت جانو جگری کی صورت اپنی طرف بڑھتی ہوئی مصیبت سے بے خبر اپنی چھولداری میں موجود تھی۔ اچانک وہ چونکی۔ سامنے دھاڑیل جانو جگری کھڑا اسے شیطانیت بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔ سوہنی کی چھٹی حس نے ایکا ایکی اسے خطرے کا احساس دلایا۔

☆......☆......☆

دھاڑیل خیرل سندھو اور پنل کے گھوڑے ساتھ ساتھ تھے۔ باقی ساتھی عقب میں چلے آ رہے تھے۔ جنگل ڈیرے کی حدود سے نکلتے ہی یہ لوگ جب رئیس کے گوٹھ کی حدود میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے گھوڑوں کی رفتار کم کر دی۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے پندرہ رکنی گروہ کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک کی کمان خود سنبھال لی جب کہ دوسرے کی کمان اپنے ایک مقربِ خاص دھاڑی ساتی منٹھار علی

کے سپرد کر دی اور اسے رئیس کی حویلی کے عقب میں پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ اپنے کل آٹھ ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا تو باقی اپنے سات ساتھیوں کے ساتھ وہ آگے بڑھا۔

کیکر اور سریں کے درختوں کا یہ گھنا جنگل پار کر آئے تھے اور اب تاریکی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کے کنارے واقع قدِ آدم خودرو جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے اور پوری تاریکیوں کا طباق چاند بھی روشن تھا مگر آوارہ بادلوں کے ٹکڑوں میں وہ گاہے بگاہے اپنی روشن چھب دکھا کر پھر ان کے پیچھے ہو رہا تھا۔ دور کہیں آوارہ کتوں اور السائے ہوئے گیدڑوں کے چلانے کی مدھم سی آوازیں چہار اطراف چھائے گہرے دم بہ خود سناٹے میں لرز رہی تھیں۔ ادھر یہ لوگ اس بات سے قطعاً بے خبر تھے کہ یہ جن کی موت بن کر اپنے جس شکار کے پیچھے جا رہے تھے وہ خود ان کی موت کی صورت گھات لگائے دانت نکوسے بیٹھے تھے چنانچہ اسی سے شکار شکاری بننے والا تھا اور شکاری شکار۔

اچانک رات کے چیختے ہوئے سناٹے میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔ خیرل سندھو اور پنل کے عقب میں آتے ہوئے ساتھیوں میں سے چار دل خراش چیخوں کے ساتھ گھوڑوں سے نیچے آ رہے گولیوں کی ایک باڑ نے دھاڑیل خیرل سندھو کا دایاں کاندھا چھید ڈالا اور پنل کو اپنے بائیں بازو میں گولی سلاخ کی مانند گھستی محسوس ہوئی۔ وہ دونوں بھی نیچے آ رہے۔ مگر پھر زخمی ہونے کے باوجود تیزی سے قریب کے جھاڑی دار جھنڈ میں رینگ گئے اور فائرنگ کی سمت انہوں نے بھی اپنی گنوں کے دہانے کھول دیے۔ ذرا دیر قبل خاموش طوفان کی آمد دیتے ہوئے سناٹے میں ایکا ایکی جیسے پُرشور حشر بپا ہو گیا تھا۔ خیرل سندھو کا دایاں کاندھا بری طرح گھائل تھا۔ شکر تھا کہ ہڈی سلامت رہی تھی۔ چند گولیاں اگرچہ گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھیں مگر اکا دکا ابھی تک گوشت میں پیوست تھیں۔ خیرل سندھو اس تکلیف کو خاطر میں لانے والا کہاں تھا۔ جم کر جوابی فائرنگ میں مصروف تھا البتہ پنل پہلی بار ایسے حالات

سے گزرا تھا مگر اس نے اپنے حواس قابو میں کر رکھے تھے اور برابر مقابلے میں مصروف تھا۔ ادھر باقی ساتھی بھی نامعلوم حملہ آوروں پر گولیاں برسا رہے تھے خیرل کو فوراً اندازہ ہو گیا تھا کہ ضرور اپنے ہی گروہ کی کسی کالی بھیڑ نے مخبری کر ڈالی ہے، لیکن اس سے موجودہ حالات کی سنگینی سے نمٹنا پہلے ضروری تھا۔ ان پر حملہ سب سے پہلے دور کھیتوں میں چھپے رئیس کے مسلح آدمیوں نے کیا تھا۔ ان کی تعداد دس بارہ کے قریب تھی اور ان میں پولیس کی نصف تعداد بھی شامل تھی جب کہ باقی نصف نے حویلی کو اپنے حفاظتی حصار میں لے رکھا تھا۔

دھاڑیل خیرل سندھو نے آناً فاناً پانچ دشمنوں کو مار گرایا۔ اس کے تین ساتھی بھی جم کر مقابلہ کر رہے تھے۔ فضا میں بارود کی ناگوار بو پھیلنے لگی تھی پھر معاً ہی انہیں جنوبی سمت سے بھی فائرنگ سنائی دینے لگی۔ یہ وہ علاقہ تھا جدھر خیرل سندھو نے اپنے آٹھ ساتھیوں کے دوسرے ٹولے کو منٹھار علی کی کمانڈ میں روانہ کیا تھا۔ اس نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی طرح ان پر بھی ایسا ہی اچانک حملہ ہوا تھا۔ گولیوں کی گھن گرج سے پورا ماحول گونج رہا تھا۔ پنل بھی باقاعدہ نشانے لے کر دشمن گرانے میں محو تھا۔ پھر پنل خیرل سے ذرا جدا ہو گیا۔ اچانک اس کی نظر تاروں کی مدھم روشنی میں اس خبیث حوالدار حکم داد پر پڑی۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ جوش اور جلد بازی کے باعث وہ اپنی حفاظتی احتیاط بھی بھلا بیٹھا اور یک دم جھاڑیوں سے ابھر کر حوالدار کا نشانہ باندھنے لگا۔ ادھر اچانک خیر سندھو بھی لڑتے لڑتے اس کے قریب آ گیا تھا۔ ادھر پنل نے جیسے ہی حوالدار حکم داد کا نشانہ لینا چاہا اچانک ایک دشمن کی گن نے پورا برسٹ اُگلا۔ خیرل سندھو کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے غصے سے دانت پیسے، پنل کے قاتل دشمن پر برسٹ فائر کر دیا۔ وہ بھی خون کی چھپڑی میں ڈوب گیا۔ پھر وہ زمین پر گرے ہوئے بے سدھ پنل کی طرف لپکا، مگر وہ مر چکا تھا۔ خیرل سندھو کو اس کی موت کا بہت دکھ ہوا اور وہ پنل کی لاش کو متاسفانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دل گیر لہجے میں

بڑبڑایا۔

"میں نے تجھے کہا بھی تھا نہ جا! یہ تیرے بس کا کھیل نہیں" پھر وہ جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا آگے بڑھنے لگا۔ اس کے دیگر تین ساتھی بھی دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے ان کے ساتھ آن ملے تھے۔ منٹھار علی اور دیگر دھاڑیل ساتھی بے جگری سے رئیس کے آدمیوں اور پولیس سے مقابلہ کر رہے تھے۔ رئیس کے کافی آدمی مر چکے تھے باقی شاید میدانِ کارزار سے کھسکنے لگے تھے۔ اب پولیس کی کچھ تعداد موجود تھی۔ خیرل سندھو اب باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت مقابلہ کر رہا تھا۔ اس نے حوالدار حکم داد کو بھی اس لڑائی میں شریک دیکھ لیا تھا۔ وہ اب اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ جنگلی بلے کی طرح جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا حوالدار حکم داد کے بالکل سر پر جا پہنچا اور پھر یک دم اس نے جھاڑیوں سے ابھر کر اپنی کلاشنکوف اس کی کنپٹی سے لگا دی۔ حوالدار حکم داد اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ دھاڑیل خیرل سندھو نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اپنے کتوں سے کہو کہ فائرنگ روک کر ہتھیار پھینک دیں ـــــ ورنہ تیری کھوپڑی اڑا دوں گا میں۔"

حوالدار حکم داد کا ویسے ہی خون خشک ہو رہا تھا اس نے جلدی سے اپنا سروس ریوالور پھینکا پھر چلا کر اپنے سپاہیوں سے بھی فائرنگ روک کر ہتھیار پھینکنے کا لرزندہ حکم دیا۔ سپاہیوں نے اپنے افسر کو گن پوائنٹ پر دیکھا تو فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی۔

فضا میں یک لخت سناٹا چھا گیا۔ پھر دھاڑیل خیرل سندھو نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو آواز دی تو انہوں نے آگے بڑھ کر پولیس کے پھینکے ہوئے ہتھیاروں کو اٹھا لیا۔ ان میں رئیس کے چند آدمی بھی یرغمال بنا لیے گئے۔ خیرل کے صرف نو ساتھی زندہ بچے تھے پھر یہ لوگ انہیں گن پوائنٹ پر دھکیلتے ہوئے رئیس کی حویلی کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

"حکم داد! اپنے سپاہیوں سے کہو کہ اندر حویلی جا کر رئیس سے کہیں کہ اگر وہ

خیریت چاہتا ہے تو پنل کے بیوی بچے اور اس کے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ دے۔"

دھاڑیل خیرل سندھو نے اسے دوسرا حکم دیا۔ حوالدار حکم داد نے فوراً اپنے چند سپاہیوں کے سامنے یہی حکم دہرایا۔ وہ سپاہی فوراً حویلی کے اندر داخل ہو گئے خاصی دیر بعد وہ نکلے تو پنل کے بوڑھے ماں باپ، اس کی بیوی ریشماں اور اس کا معصوم بچہ اندر سے نمودار ہوئے۔ وہ سب حیران پریشان بری طرح ڈرے سہمے ہوئے تھے۔

پھر دھاڑیل خیرل سندھو نے رئیس کو بھی پیغام دیا کہ وہ باہر نکلے ورنہ حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ وہی پانچ چھ سپاہی دوبارہ حویلی میں داخل ہوئے اور ذرا ہی دیر بعد رئیس کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوئے۔ رئیس کے چہرے سے پریشانی اور تفکر مترشح تھا۔ رئیس کو دیکھ کر دھاڑیل خیرل سندھو نے چلا کر اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"رئیس! میں چاہوں تو تجھے ابھی گولیوں سے بھون کر رکھ دوں، مگر یہ کام میں کسی وقت بھی بہت آسانی سے انجام دے سکتا ہوں۔ میری بات کان کھول کر سن لے اگر تو نے ان غریبوں کو دوبارہ ستانے کی کوشش کی تو یاد رکھ میں تجھے دوبارہ زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے پنل کے بدنصیب گھر والوں کو وہاں سے فوراً جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بے چارے لرزتے کانپتے اس خدائی فوجدار اور اپنے نجات دہندہ کو حیرت آمیز نظروں سے تکتے ہوئے فوراً تاریکی میں گم ہو گئے۔ اس کے بعد دھاڑیل خیرل سندھو اپنے ساتھیوں سمیت واپس جنگل ڈیرے کی طرف لوٹ گیا اور لوٹتے سمے وہ سوہنی کے غیرت مند اور بے جگر بھائی محمد پنل کی لاش اٹھانا نہیں بھولا تھا۔

☆......☆......☆

سوہنی نے غدار جانو جگری کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی شیطانیت کو فوراً بھانپ لیا تھا اور جانو جگری اپنے بدہیئت ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ لیے اس کی طرف دھیرے دھیرے قدم بڑھانے لگا۔ سوہنی کا دل متوحش انداز میں بے طرح دھڑکنے

لگا۔ رائفل اس کے قریب ہی چھوالداری کی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی۔ جانو جگری کے کاندھوں سے کلاشنکوف جھول رہی تھی جسے اس نے ابھی اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

وہ سوہنی کو ایک پکا ہوا پھل سمجھ رہا تھا۔ سوہنی نے متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ جانو جگری بولا۔

"آ جا میری رانی! اب تو میری ہے۔۔۔ صرف سردار جانو جگری کی۔"

سوہنی لرز اٹھی اور کپکپاتے لہجے میں بولی۔

"ی۔۔۔ی۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں تمہارے سردار سے شکایت کر دوں گی تمہاری!"

"ہا۔۔ہا۔۔ہا۔۔۔ سردار؟ کیسا سردار؟ اسے تو اب تک پولیس اور رئیس کے آدمیوں نے ختم بھی کر ڈالا ہوگا۔"

وہ بدمست قہقہہ لگا کر بولا اور سوہنی فوراً اپنی رائفل کی طرف لپکی مگر جانو جگری نے اسے بے بس چڑیا کی طرح دبوچ لیا۔

"نا۔۔۔نا۔۔۔نا۔۔۔ تیرے نازک ہاتھ یہ بھاری ہتھیار اٹھانے کیلئے نہیں بنے، میری رانی!" وہ طنز آمیز لہجے میں بولا۔

سوہنی اس کے شکرے جیسے پنجوں میں بے بس شکار کی طرح تڑپنے لگی۔

"چھوڑ دے مجھے۔۔۔ غدار کتے!۔۔۔ تو جھوٹ بولتا ہے۔ میرا خیرل ابھی آ جائے اور ادا پنل بھی۔۔۔ تیرے ٹوٹے کر دے گا!" سوہنی نے دانت پیس کر کہا۔

"وہ دونوں اب کبھی نہیں آئیں گے اور پھر میں نے بھی تو وہی کیا ہے جو خیرل نے اپنے سردار بگن دھاڑیل کے ساتھ کیا تھا۔ اسے دھوکے سے ہلاک کر ڈالا تھا۔"

غدار جانو جگری نے اس بار خون خوار لہجے میں اس سے کہا اور اس کے ساتھ دست درازی شروع کر دی۔ ساتھ ہی ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اب اس پورے گروہ کا صرف میں سردار ہوں۔۔۔ جانو جگری!۔۔۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔" وہ طاقت کے نشے میں چور تھا۔ ایک موقع پر اچانک سوہنی نے اس کے نازک مقام پر زور سے اپنا گھٹنا رسید کر دیا۔ جانو جگری کو اس سے اتنی جرأت کی توقع نہ تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے تھوڑا کراہا تھا۔ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی سوہنی تڑپ کر آزاد ہو گئی اور بڑھ کر پھرتی سے اپنی دیوار سے ٹکی ہوئی رائفل اٹھالی اور فوراً اسے جانو جگری پر تان لیا۔ ایک لمحے کو جانو جگری کے چہرے پر سناٹا چھا گیا مگر اس کی آنکھوں میں ابھی تک خون خواری اور سفاک چمک کم نہ ہوئی تھی۔

"چھوکری! یہ غلطی نہ کرنا۔۔۔ باہر سب میرے اپنے ساتھی موجود ہیں۔ وہ سب کے سب تجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے۔ پھینک دے اس کھلونے کو شاباش! میں تیرا سہارا بنوں گا۔ تجھ سے شادی۔۔۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سوہنی نے لبلبی دبادی رائفل پہلے ہی سے برسٹنگ پوائنٹ پر ایڈجسٹ تھی۔

نتیجتاً رائفل نے گرج دار آواز کے ساتھ ایک پورا برسٹ اُگلا تھا جس نے غدار جانو جگری کا سینہ چھلنی کر کے رکھ دیا۔ وہ کربیہ انگیز چیخ مار کر زمین بوس ہو گیا۔

مرتے وقت اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اسے شاید ایک سیدھی سادی دیہاتی ان پڑھ لڑکی سے ایسی مارا ماری کی توقع ہرگز نہ تھی۔ گولیوں کی آواز سن کر جانو جگری کے حمایتی اور خیرل سندھو کے ساتھی بھی اندر آ گئے۔ سوہنی نے انہیں بتایا کہ یہ خبیث جانو جگری کس نیت سے اس کے پاس آیا تھا نیز اس نے ان کے سردار خیرل سندھو کے ساتھ کیسی سازش چلی تھی۔ جانو جگری کے حامیوں کا اس کی لاش دیکھ کر حوصلہ جاتا رہا تھا اس لئے وہ سردار خیرل کے بے جگر آدمیوں کے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے البتہ خیرل سندھو کے آدمی پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے پہلے تو

غدار جانو جگری کی لاش پر حقارت سے تھوکا پھر سوہنی کو تسلی دیتے ہوئے آپس میں صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ انہیں باہر شور سا سنائی دیا۔ یہ لوگ چونک کر باہر نکلے۔ سوہنی بھی باہر آ گئی اور دھک سے رہ گئی۔ سامنے خیرل سندھو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے سے نیچے اتر رہا تھا اور اس کے کاندھوں پر اس کے بھائی پنل کی لاش تھی۔

وہ "اداپنل!" کہہ کر ہسٹریائی انداز میں چلا کر دوڑی اور بھائی کی خون آلود لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔

خیرل سندھو نے اسے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے چھوڑ دیا۔ ذرا دیر بعد اسے بتا دیا گیا کہ یہ ساری سازش اس غدار جانو جگری کی تھی۔ پھر خیرل سندھو نے سسکیاں لیتی ہوئی سوہنی کو سنبھالا اور اسے بتایا کہ اب اس کے گھر والوں کو کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ اگر وہ اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے تو چلی جائے۔

سوہنی نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تو خیرل سندھو کے دل کو گھونسا لگا۔ وہ اندریں دل سے یہی چاہتا تھا کہ سوہنی نہ جائے مگر اس نے اپنے دل پر قابو پایا اور اپنے چند ساتھیوں کی حفاظت میں سوہنی کو اس کے گوٹھ روانہ کر دیا۔ پنل کی لاش بھی وہ لے گئے تھے۔

سوہنی کے جاتے ہی دھاڑیل خیرل سندھو اداس سا ہو گیا تھا۔ اسے سوہنی سے ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے گی کیونکہ وہ اسے دل سے پسند کرنے لگا تھا وہ رنجور سا ہونے لگا۔

خاصی دیر بعد اس کے ساتھی واپس لوٹے تو وہ بری طرح ٹھٹکا۔ سوہنی اپنے بھائی کی تدفین کے بعد واپس آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

گردش

وہ بڑا عجیب ،رقت آمیز اور دل فگار منظر تھا۔کچی دیواروں والے ایک بوسیدہ سے صحن میں ۔۔۔۔مضطرب الحال سے وہ کُل چھ افراد موجود تھے۔جن کے پژمردہ چہروں پر اس وقت غم ناک پرچھائیاں طاری تھیں۔رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی۔آسمان صاف اور روشن تھا۔چاند کی دمکتی روشنی میں گارے مٹی کی بوسیدہ دیواروں کے سائے بھی دم بہ خود سے پراسرار ہیولوں کی طرح اس رقت بھرے غمگسار منظر کو جیسے خامشی سے گھورتے محسوس ہو رہے تھے۔

دو دیہاتی وضع قطع کی عمر رسیدہ عورتیں،جنھوں نے سروں پر اجرکوں کی میلی سی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ایک نوجوان اور ایک خوب صورت لڑکی کو باری باری اپنی چھاتی سے لگا کر سسک رہی تھیں۔لڑکی نے نیا نویلا مقامی طرز کا جھلملاتا سندھی

،بلوچی،بھرت کا سوٹ پہن رکھا تھا۔وہ درمیانی قدامت کی نہایت معصوم صورت اور حسین لڑکی تھی۔اس کے چہرے کی رنگت بالکل شفاف بے داغ اور سرخی مائل سپید تھی آنکھیں بڑی بڑی سرمگیں جیسے گھاس کی نرم نرم پتیوں پر شبنمی بوندیں چمکتی ہیں ناک پر چاندی کا ابلق اور ماتھے سے جھالردار چھگن جھول رہا تھا۔اس کی صراحی دار شفاف گردن میں ایک صحرائی طرز کا چاندی کا کھری کنٹھا بھی نظر آ رہا تھا۔اس کے سپید سپید ہاتھوں پیروں کی حنائی انگلیوں میں چند مزید چھوٹے چھوٹے تانبے کے چاندی لگے زیوارت بھی جھلملا رہے تھے لیکن اس وقت بہ حیثیت مجموعی ۔۔۔۔چھوٹی چھوٹی معصوم خوشیوں کو کشید کرتی ہوئی ان سب چیزوں کی ضوفشانی ماند پڑ چکی تھی۔یہی نہیں بذات خود لڑکی ایک نوبیاہتا۔۔۔۔مگر افسردہ اور غم زدہ دلہن کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

یہ سارا منظر ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا جیسے ایک لڑکی کو دلہن بنا کر بابل کے دیس سے ''وداع'' کیا جا رہا ہو۔۔۔۔اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس لڑکی کا،جس کا نام نوراں تھا۔آج شام کو ہی محمد وسان نامی ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ نکاح پڑھا دیا گیا تھا۔جو خود بھی اس وقت اپنی نوبیاہتا دلہن نوراں کے ساتھ ہی خاموش کھڑا تھا۔

وہ ایک چوبیں پچیس سالہ گبرو جوان تھا۔رنگت سانولی اور چہرے کے نقوش خالص دیہاتی طرز کے موٹے موٹے اور وجیہ تھے۔اس نے اجلی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور پیروں میں کھڑیاں تھیں۔سر پر شیشے کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی اور کاندھے پر اجرک ڈال رکھی تھی۔کوئی اور موقع ہوتا تو یہ نوجوان،نوراں جیسی ملنے والی ایسی حسین دلہن پر خود اپنی قسمت پر رشک کر رہا ہوتا۔لیکن اس سے تو جیسے کسی نظر نہ آنے والی منحوس آفت نے ان سب کی خوشیوں اور شادمانیوں کو ملیامیٹ کر ڈالا تھا کیوں کہ دولہا محمد وسان کے چہرے پر خوشی کی بجائے گہرے تفکر اور قدرے غیظ و جوش کے بھی آثار نظر آ رہے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے وہاں موجود ان چاروں عمر رسیدہ مرد و عورتوں نے،جو بلاشبہ ان دونوں نوبیاہتا دلہن کے ماں باپ ہی تھے۔۔۔نوجوان

محمد وسان کی بڑی منت سماجت اور اپنے بڑھاپے کا واسطہ دے کر بالآخر کسی ایسے اقدام پر مجبور کر ڈالا تھا۔۔۔جس پر وہ قطعی راضی نہ ہو۔ روتی، سسکتی دلہن کو بار بار اپنے سینے سے لگانے والی ان دو عمر رسیدہ عورتوں میں ایک اس دلہن کی ماں مائی عجیباں تھی اور دوسری عورت اس کی ساس یعنی نوجوان کی ماں حیاتاں بی بی تھی۔۔۔جو دلہن نوراں کی چاچی بھی لگتی تھی۔۔۔نوراں کا بوڑھا سسر مٹھل بھی وہاں موجود تھا اور اس کا باپ احمد بخش بھی۔ یہ دونوں بیک وقت آپس میں بھائی اور اب سمدھی بن چکے ہیں۔

غم اگر محض بیٹی کو رخصت کرنے ہی کا ہوتا تو اس وقت وہ سب لوگ اس قدر دل گرفتہ اور رنجور و مجبور نہ ہوتے۔ دکھ تو اس بات پر انہیں ہو رہا تھا کہ جن کڑے حالات کی آندھی میں ان دونوں نوبیاہتا میاں بیوی کو اس غمگسار رات کے درمیانی پہر مکمل راز داری کے ساتھ گھر سے ہی نہیں بلکہ گوٹھ سے بھی باقاعدہ ہجرت کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ وہ ان سارے افراد کیلئے کسی کڑے امتحان سے کم نہ تھا۔

رات کے پہر اس پر اسرار ہجرت آمیز رخصتی کے پس پردہ در حقیقت ایک خونچکاں داستان مضمر تھی۔ ہجرت کے اس عمل پر جہاں دکھ اور غم ہجراں کی کسک تھی اس سے کہیں زیادہ ان سب کے دلوں میں ایک انجانا خوف اور اندیشوں کے ناگ بھی پھن کاڑھے ہوئے موجود تھے۔

بہر طور جب رونے دھونے اور آنسو بہا کر بار بار گلے ملنے کا یہ رقت آمیز عمل طول پکڑنے لگا تو بالآخر نوجوان دولہے محمد وسان کے باپ مٹھل نے اپنی بیوی حیاتاں سمیت سمدھن کو بھی تنبیہہ آمیز سرگوشی میں کہا۔

''ارے بابا! اب یہ رونا دھونا چھوڑو دیر نہ کرو جلدی سے اب ان دونوں کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرو۔ تڑکے سے پہلے پہلے یہ دونوں یہاں سے جتنی دور نکل جائیں اتنا ہی چنگا (بہتر) رہے گا۔''

اس کی بات پر لڑکی کی ماں مائی عجیباں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ملتجی

لہجے میں سمدھی مٹھل سے کہا۔

''ادا اتنا کٹھور نہ بن۔ میکوں اپڑیں دھی راڑیں سے چنگی طرح مل تو لینے دے۔ پتا نہیں پھر کب۔۔۔؟'' فرط رقت و غم سے عجیباں کی آواز رندھ کر حلق میں ہی بھنچ سی گئی تو مٹھل قدرے تیز مگر دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''ادی! بیٹے اور بیٹی کا تو یہ دکھ اب ہم سب کو ہی مل کر بھگتنا پڑے گا۔ اسی میں ان دونوں بچوں کی بہتری ہے۔ یہ تسلی تو دل کو رہے گی ناں کہ یہ دونوں زندہ تو ہوں گے۔ میرا اپڑاں پٹ بھی تو ہے وسان تو میری ساری حیاتی کی کمائی ہے ادی! میرا بھی تو جگر ہے نا بابا۔۔۔ اپڑیں حیاتی سے دور کر رہا ہوں اسے۔''

بوڑھے مٹھل کے لہجے میں درد و الم کی گہری کاٹ تھی۔ اس نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے امڈ پڑنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی خاطر اپنا سر جھکا دیا تھا۔ ایسے میں احمد بخش اپنی بیوی عجیباں کو ٹوکتے ہوئے ذرا اونچی آواز میں بولا۔

''چل اب چپ کر بھائی مٹھل صحیح بولتا ہے۔ حیاتی رہی تو دوبارہ ہم اپڑیں بچوں سے مل لیں گے۔'' خود احمد بخش کی آواز یہ کہتے کہتے بوجھل سی ہو رہی تھی۔ وہ پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ دبلا پتلا اور سانولی رنگت کا مالک۔ اپنے بڑے بھائی اور سمدھی مٹھل سے دو سال ہی چھوٹا تھا۔ دونوں بوڑھے بھائی وڈیرے دریا خان کی زمینوں پر دہاکی (مزدوری) کرتے تھے۔ قدرے توقف کے بعد احمد بخش اپنے بھائی مٹھل سے مخاطب ہو کر بولا۔

''بھا۔۔۔! باہر بیل گاڑی تو تیار ہے ناں۔۔۔؟''

''ہاؤ ادا بخشل۔۔۔! بس ان دونوں بالکوں (بچوں) کے نکلنے کی دیر ہے۔''

مٹھل کے لہجے سے اب جلد از جلد ان دونوں دولہا دلہن کو رخصت کرنے کی عجلت آمیز پریشانی ہونے لگی تھی۔

"ہاؤ بابا۔۔۔ چلو اب۔۔۔ تم دونوں۔۔۔ اندر جاؤ۔۔۔ تمہارے رونے کی آواز سے دیواروں کے بھی کان کھڑے نہ ہو جائیں۔" اس نے آخر میں عجیباں اور حیاتاں کو اندر کوٹھری نما ایک کمرے میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ دونوں بے چاریاں ستم رسیدہ مائیں اب کے آخری بار دلہن نوراں اور دولہا محمد وسان سے گلے مل کر اور انہیں مجبور نگاہوں سے دیکھتی اور اپنے آنسو پونچھتیں وہاں سے چلی گئیں۔

دروازے کے باہر۔۔۔ بیل گاڑی موجود تھی۔ جس پر ترپال اور رلی کی گودڑی سی بچھا دی گئی تھی۔۔۔ بیل گاڑی کے جوئے میں جتے ہوئے دو توانا بیل۔۔۔ اس وقت اپنی لسائی ہوئی موٹی موٹی ابھرواں آنکھوں میں عجیب سی معصومیت سموئے خاموشی سے کھڑے تھے۔

ایک ٹین کا صندوقچہ تھا اور دیگر چھوٹا موٹا سامان بیل گاڑی پر لادا جانے لگا پھر دلہن نوراں کو بھی۔۔۔ آہستگی سے بیل گاڑی پر سوار کرا دیا گیا۔ اس کے بعد اس کا شوہر محمد وسان بھی بیلوں کے پشتوں والے گاڑی کے تختے پر لگامیں تھامے براجمان ہو گیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے بیلوں کو مخصوص آواز میں ٹٹکارتے ہوئے انہیں آگے بڑھا دیا۔ بیل گاڑی کے چوبی پہیے رات کی اس غمگسار تاریکی میں ہولے سے چر چرائے اور پھر یہ آگے بڑھ گئے۔۔۔ سامنے گلی میں دور تک ویرانی اور تاریکی تھی۔ چہار سو غضب کا سناٹا طاری تھا۔ گھر کے دروازے پر موجود دولہا دلہن کے بدنصیب ماں باپ غم ناک آنکھوں سے بیل گاڑی کو جاتا دیکھ رہے تھے۔ پھر جب بیل گاڑی کے نچلے تختے کی چولی ناب سے بندھی جھولتی ہوئی لالٹین کی جوت کو بھی تاریکی نے نگل لیا تو یہ سب دل تھامے۔۔۔ اندر چلے گئے۔

باہر تاریک رات، بھاری سِل کی طرح سرک رہی تھی۔

☆......☆......☆

بیل گاڑی اب کچے پکے بے ترتیب گھروں کی اندھیری گلیوں سے نکل کر۔۔۔ ایک بل کھاتی پگڈنڈی پر آ گئی تھی۔ دائیں بائیں دور تک تاریکی میں ڈوبے ہوئے کھیت پھیلے ہوئے تھے آسمان پر آنکھ مچولی کرتے تاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں۔۔۔ محمد وسان۔۔۔ بیل گاڑی کو اب باقاعدہ تیز دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ عقب میں دور گھروں کی بے ترتیب قطاروں کو تاریکی نے نگل لیا تھا۔ سامنے بل کھاتی ناہموار پگڈنڈیاں دور تک سنسان تھیں۔۔۔ ذرا آگے۔۔۔ آوارہ کتوں کے غول نے آ لیا۔

انہوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مگر وسان لاتعلق سا بیلوں کی رسی تھامے انہیں آگے کو ہنکانے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر گہری تفکر آمیز سنجیدگی کے ساتھ ایک جوش کی تمتماہٹ بھی مترشح تھی۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں اس وقت ماضی کے جلتے مناظر گھوم رہے تھے۔ وہ اندر ہی اندر اس قدر پریشان کن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اسے اس بات کا بھی دھیان نہ رہا تھا کہ۔۔۔ اس کے عقب میں ترپال پر۔۔۔ اس کی نوبیاہتا دلہن۔۔۔ نوراں بھی سکڑی سمٹی بیٹھی ہولے ہولے سسک رہی تھی۔۔۔ جو غالباً منتظر تھی کہ۔۔۔ ایسے کڑے وقت میں اس کا شوہر دل جمعی کے دو بول ہی کم از کم بول لیتا۔۔۔ لیکن۔۔۔ محمد وسان۔۔۔ تو کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ۔۔۔ اس نے جو کچھ کیا۔۔۔ وہ غلط کیوں تھا؟ بلکہ درست ہوتے ہوئے بھی وہ غلط کیوں تھا؟ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اسے مجرم بنا دیا گیا تھا۔ جھوٹ کے آگے۔۔۔ مصلحت کے نام پر سچ کو کیوں بٹھایا جا رہا تھا۔۔۔ اس لیے کہ۔۔۔ وہ ایک غریب ہاری کا بیٹا تھا اور شاید یہ اس کا سب سے بڑا جرم تھا۔۔۔ سنا تھا۔۔۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر یہاں تو سچ کے پاؤں کاٹے جا رہے تھے۔ وسان کو گوٹھ بدر ہونے کا اتنا دکھ نہ تھا۔ دکھ تھا تو اسے اپنے بوڑھے ماں

باپ اور چاچاچی کا۔۔۔جو اس کے اب سسرالی بھی بن چکے تھے انہیں اکیلا چھوڑنا پڑ رہا تھا۔ پتا نہیں کل کا سورج ان ہجر کے مارے غریب بوڑھوں پر کیسی کیسی آفتیں لانے والا تھا۔ اس کا تکلیف دہ احساس۔۔۔وسان کا جگر پاش پاش کیے دے رہا تھا۔

وہ دل مسوس کر سوچنے لگا کہ بعض مرتبہ انسان اپنوں کی منت سماجتوں کے آگے کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔کہ اسے ان کا کڑے سے کڑا فیصلہ۔۔۔ناچاہتے ہوئے بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ وہ تو ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا کیا پھر۔۔۔جب اس کے بوڑھے ماں باپ اور چاچاچی نے اپنی ٹوپیاں اور سر کی چادریں اس کے قدموں پر ڈال کر اسے راتوں رات اپنی دلہن کو لے کر گوٹھ سے نکل جانے کا اصرار کیا تو مجبوراً محمد وسان کو اپنوں کے اس تلخ فیصلے کا گھونٹ بھرنا پڑا تھا۔

بیل گاڑی کے پیچھے بھونکتے ہوئے آوارہ کتوں کا غول اب۔۔۔غائب ہو چکا تھا۔ تاروں بھری رات۔۔۔کسی الہڑ دلہن کی سیج کی طرح سجی ہوئی تھی۔ اب تو ان کے عقب میں آبادی کے ساتھ۔۔۔ساتھ۔۔۔کھیت کھلیان بھی بہت پیچھے رہ گئے تھے اور دور سے ہیولوں کی طرح انہیں خدا حافظ کہتے محسوس ہو رہے تھے۔ آس پاس۔۔۔مدہم روشنی میں پھیلا ہوا۔۔۔بھربھری مٹی اور کہیں کہیں چھدری چھدری اور خودرو جھاڑیوں کا میدان شروع ہو چکا تھا۔ کچھ کیکر کے درختوں کے اونگھتے ہوئے سے جھکے جھکے ہیولے بھی نظر آنے لگے تھے۔ فضا میں اب خنک ہوا سی محسوس ہونے لگی۔ وسان نے فوراً اندازہ لگایا کہ۔۔۔وہ دریائے سندھ سے زیادہ دور نہیں اس نے بیلوں کی پشت پر پتلی ٹہنی والا چابک رسید کر دیا۔ مقصد بیلوں کو تیز دوڑانا تھا۔ کیوں کہ اسے سختی سے اس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ وہ جتنی جلد ہو سکے دریائے سندھ کا یہ چوڑا پاٹ عبور کر کے دوسرے کنارے اتر جائے۔ ایک بار وڈیرے حاجی پیارو خان کی جاگیر میں داخل ہونے کے بعد وہ اور اس کی نو بیاہتا دلہن بالکل محفوظ ہو جائیں گے۔۔۔کیوں کہ وڈیرا حاجی پیارو خان نہ صرف اپنے علاقے کا سردار تھا بلکہ وہ ایک

انتہائی انصاف پسند اور خدا ترس انسان بھی تھا۔ مظلوموں کو پناہ دیتا تھا ان کی دادرسی کرنے کے معاملے میں وہ خاصا مشہور بھی تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی پورے "تھر" کے علاقے میں شہرت تھی۔

وڈیرے حاجی پیارو خان کی جاگیر میں پناہ لینے کا مشورہ کس حد تک درست تھا؟ ابھی یہ دونوں معصوم نہیں جانتے تھے۔ انہیں بس اتنا معلوم تھا کہ۔۔۔پو پھٹنے سے پہلے پہلے۔۔۔انہیں زمیندار دریا خان اور اس کے بھیڑیا صفت کارندوں کے علاقے سے دور۔۔۔بہت دور نکل جانا ہے۔ سو وہ ایسا ہی کر رہے تھے۔ وسان بظاہر خاموشی سے بیلوں کو دوڑانے میں محو تھا۔۔۔مگر اندر اس کے طوفانی ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اس کی بظاہر اندھیروں کو گھورتی لہو رنگ آنکھوں میں بار بار۔۔۔زمیندار دریا خان اور اس کے مقربِ خاص۔۔۔کارپرداز 'گہرام' کے مکروہ چہرے رقصاں تھے۔ یہ دونوں وہ چہرے تھے جن سے۔۔۔محمد وسان کو شدید حد تک نفرت تھی۔ انہی دونوں کی وجہ سے اسے آج یہ دن دیکھنے پڑ رہے تھے کہ وہ۔۔۔ناچاہتے ہوئے بھی گوٹھ بدر ہونے پر مجبور ہوا تھا یوں تو اس نے ان دونوں شیطانوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی تھی مگر۔۔۔وہ۔۔۔وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ہاتھ جوڑنے اور رو رو کر منتیں سماجتیں کرنے سے مجبور ہو گیا تھا۔ کیوں کہ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ۔۔۔اگر ان کے کڑیل اور جوشیلے بیٹے محمد وسان سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہو گئی تو وڈیرا اور اس کے خونخوار حواری نہ صرف ان کے جوان اکلوتے بیٹے کو مار ڈالیں گے بلکہ ان کے گھروں کو بھی جلا کر بھسم کر دیں گے۔ مولو ہاری، خیر بخش ہاری اور ہاری خدا بخش کا حشر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جنہوں نے زمیندار دریا خان اور اس کے حواریوں سے ٹکر لینے کی کوششیں کی تھیں اور ان کا پھر بھی کیا عبرت ناک حشر ہوا تھا کہ پورا گوٹھ اس انسانیت سوز بربریت پر لرز اٹھا تھا۔ اس لئے مٹھل ہاری اور احمد بخش ہاری نے وسان اور نوراں کو راتوں رات رشتۂ ازدواج میں منسلک کر کے ان دونوں کو زمیندار دریا خان

کے علاقے سے نکال دیا تھا۔

رات کا نصف پہر بیت چکا تھا۔ بیل گاڑی اب ایک ایسے میدان سے گزر رہی تھی جہاں جابجا کھجی کے درخت پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے باپ مٹھل اور سسر احمد بخش نے اسے تاکید کی تھی کہ۔۔۔ وڈیرے حاجی پیارو خان۔۔۔ کے پاس جا کر اسے ساری حقیقت سے بلا کم و کاست آگاہ کر دے اور ساتھ ہی مدد کی فریاد کرے۔۔۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ۔۔۔ وسان نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔

وہ کڑھتے ہوئے دل کے ساتھ سوچتا کہ۔۔۔ آخر وہ کب تک زمینداروں اور وڈیروں کے رحم و کرم پر رہیں گے؟ اسے ایسی زندگی سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔۔۔ جہاں اندھیرا تھا جہاں غریب انسان بے کس اور مہر بہ لب زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اپنے حق کیلئے آواز نہیں بلند کر سکتا تھا۔ اگر ایسی کوئی جرأت کرتا بھی تو اسے دبا دیا جاتا۔۔۔ یا پھر صفحۂ ہستی سے ہی مٹا کر رکھ دیا جاتا۔ تف ہے ایسی زندگی پر۔۔۔ اس سے تو اچھا ہے کہ انسان زہر کھا کر مر جائے۔۔۔ مگر میں۔۔۔ ایسا نہیں ہونے دوں گا۔۔۔ میں اپنے اوپر۔۔۔ اپنے ماں باپ پر عرصہ حیات تنگ کرنے والوں سے ضرور نمٹوں گا ایک دن۔۔۔ ضرور نمٹوں گا۔۔۔ جوشِ غیظ سے اسے احساس ہی نہ ہوا کہ۔۔۔ آخری الفاظ بے اختیار اس کے لبوں سے پھسل کر۔۔۔ عقب میں گٹھڑی بنی بیٹھی اس کی نوبیاہتا دلہن کی سماعتوں تک جا پہنچے تھے اور اس نے بے اختیار لاج شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گھبرا کر ایک نگاہ اپنے شوہر کی طرف ڈالی اور بولی۔

"کیا ہوا سائیں؟" محمد وسان نے یک دم چونک کر عقب میں اپنی بیوی کی طرف دیکھا پھر جانے کیا سوچ کر اس نے فوراً بیلوں کی رسی کھینچ لی۔ دونوں بیل ہولے سے رک گئے۔ ماحول پر دم بہ خودی خاموشی طاری ہو گئی۔

"نوراں۔۔۔ بابا اور چاچا احمد بخش نے ہمیں کیا نصیحت کی تھی؟" محمد وسان نے گمبھیر لہجے میں اسے مخاطب کر کے پوچھا۔ نوراں کو اگرچہ اپنے شوہر کے

اس عجیب طرزِ گفتگو پر حیرت ہوئی۔ مگر بولی۔

"انہوں نے کہا تھا کہ۔۔۔ ہمیں سب سے پہلے۔۔۔ وڈیرے حاجی پیارو خان کی جاگیر میں جا کر اس کے آگے اپنی فریاد ڈالیں اور اسے مدد کی عرضی (درخواست) دیں۔"

"لیکن میں کسی کی مدد لینا نہیں چاہتا۔" وسان نے تلخ لہجے میں کہا۔ نوراں بے چاری کیا جواب دیتی۔

چپ ہو کے بیٹھی رہی۔۔۔ مگر وسان کو جواباً اس کی خاموشی کھل گئی لیکن اس بار وہ نوراں سے قدرے رسان کے ساتھ بولا۔

"نوراں۔۔۔! آخر ہم کب تک دوسروں کے آسروں اور مدد پر چلیں گے؟"

"میں سمجھی نہیں میرے سائیں۔" نوراں نے بھولے سے کہا۔

"میں نے تجھ سے کوئی فارسی بولی ہے۔" وسان نے چڑچڑے پن سے کہا۔ نوراں بے چاری پریشان ہو گئی۔

"سائیں معاف کر دیں۔۔۔ میں عقل کی کچی ہوں۔" اس کی معصومت بھرے لہجے پر وسان کو بے اختیار اس پر ترس بھی آیا۔ وسان خود پریشان تھا۔۔۔ اس کا چڑچڑا پن اس کیفیت کا مظہر تھا؟ تاہم وہ اپنے لہجے میں پیار بھری رسانیت سموتے ہوئے اس سے دوبارہ بولا۔

"نوراں۔۔۔! تو نے کبھی سوچا ہے کہ۔۔۔ ہمارے اس طرح گوٹھ سے چپ چپاتے نکل جانے کے بعد۔۔۔ بابا اور چاچا پر کیسی کیسی قیامتیں ڈھائی جائیں گی۔۔۔ انہیں کس قدر آزار پہنچایا جائے گا۔۔۔ پپ۔۔۔ پتا نہیں۔۔۔ پھر وہ زندہ بھی بچ سکیں گے یا۔۔۔" وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکا تھا اچانک نوراں نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ وسان پریشان ہو گیا۔

"اڑی چری ۔۔۔! روتی کیوں پڑی ہے ؟ اب سمجھ میں آئی نا میری بات ۔۔۔ یہ سب ہم غریبوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے ۔۔۔ ظلم کرنے والے بھی ایسے ہی ہیں اور مدد کرنے والے بھی ۔۔۔ تو کیوں نہ پھر ہم اپنے نصیبوں کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑنے کی بجائے خود کریں ۔" اسے حالات کا سنگین تجربہ ہوا تھا بے چاری سیدھی سادی نوراں کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی مگر خوف سے چپکی بیٹھی رہی ۔

"نوراں !۔۔۔ اگر ہم وڈیرے حاجی پیاروخان کی جاگیر نہ جائیں تو تجھے اعتراض تو نہ ہوگا؟" اس نے اچانک پوچھا ۔

نوراں بولی ۔ "سائیں ! اب تو میرا سب کچھ تو ہی ہے ۔۔۔ جدھر لے جائے ۔۔۔ جو کرے ۔۔۔ میرا جینا مرنا اب تیرے ساتھ ہے ۔"

وسان اس کی بات پر خوش ہو گیا ۔ "یہ ہوئی نا بات ۔۔۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو تجھے بہادر بننا ہوگا ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ۔۔۔ پر سائیں ! بابا اور چاچا کی طرف سے تو نے مجھے فکر میں ڈال دیا ہے ۔۔۔ اگر زمیندار دریا خان اور گہرام نے ان گریبوں کو ۔۔۔" وہ مارے غم کے اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی اور ایک بار پھر سسک پڑی ۔

وسان نے اسے تشفی دیتے ہوئے کہا ۔ "نوراں !۔۔۔ تو فکر نہ کر ۔۔۔ پہلے ہم کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جائیں ۔ پھر ان کا بھی کچھ سوچ لیں گے ۔"

"پر سائیں !۔۔۔ ہم جائیں گے کہاں ۔۔۔؟ ہم کو کون پناہ دے گا ۔۔۔؟" نوراں نے ایسا سوال کیا جس کا جواب وسان کے پاس بھی نہ تھا ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔ نوراں اسے خاموش پا کر بولی ۔

"سائیں ! تو پھر کیوں نہ ہم وڈیرے پیاروخان کے پاس چلے جائیں ۔ ہم اپنے گھر والوں کے لیے تو اس سے مدد لے سکتے ہیں ۔"

محمد وسان جواباً خاموش رہا ' لگ رہا تھا جیسے اسے نوراں کا مشورہ برا نہیں لگا

تھا مگر ۔۔۔ درحقیقت ایسا تھا نہیں ۔۔۔ کیوں کہ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا ۔ اس نے اپنی نو بیاہتا بیوی نوراں سے جو عندیہ لینا تھا وہ لے لیا تھا ۔ بس اس کے لیے یہ کافی تھا اس نے نوراں کو جواب دینا مناسب نہ سمجھا ۔ دوبارہ بیل گاڑی کی رسی تھام لی ۔ جنگل میں رات کے دم بہ خود اندھیروں میں اندیشوں بھرا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا ۔

☆......☆......☆

محمد وسان اب نوراں کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا ۔ لہٰذا اس نے اب وڈیرے پیاروخان کی جاگیر جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا ۔ اگرچہ وہ یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا مگر اب نوراں کا عندیہ لینے کے بعد اس نے یہی سوچا تھا کہ یہاں سے سیدھا اپنے دوست درمحمد کے ہاں جائے گا اور پھر وہیں ڈیرا جمانے کے بعد وہ اپنے ماں باپ وغیرہ کی خیر خبر لے گا ۔ اس کے دوست درمحمد کا گوٹھ زیادہ دور نہیں تھا اور نا ہی دریائے سندھ کے دوسری طرف تھا ۔۔۔ بس یہاں سے چند ہی میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے پر اس کا گوٹھ تھا ۔ وہاں تک پہنچنے کا حتمی فیصلہ کرنے کے بعد اب بیل گاڑی کی رفتار اس نے تیز کر دی ۔

مشرق افق سے سپیدہ نمودار ہونے کے بعد وہ اپنے مطلوبہ گوٹھ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا ۔ نوراں رلی اوڑھے بیل گاڑی کے پرال بھرے چوبی تختے پر سکڑی سمٹی سو رہی تھی ۔

کھیتوں میں ہاری عورتیں اور مرد کام کرتے نظر آ رہے تھے ۔ انہیں کام میں مشغول دیکھ کر محمد وسان کے جفاکش وجود میں دکھ اور احساس محرومی کی لہر ابھری ۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ زمین کا سینہ چیرنے میں مصروف ہو جائے ۔ مگر ارضی ناخداؤں نے اس کے معصوم اور محنت کش شب و روز کو سیاہ آندھیوں کی نذر کر ڈالا تھا اسے پہلے دن سے سیاہ آندھیوں کا مقابلہ کرنا تھا مگر ۔۔۔ محمد وسان نے دل میں اپنے تئیں فیصلہ کر لیا تھا کہ حالات کا مردانہ وار ڈٹ کر مقابلہ کرے گا ۔۔۔ تھوڑی دیر بعد

محمد وسان نے ایک کچے گھر کے سامنے بیل گاڑی روک دی۔ دیواروں پر اپلے تھپے ہوئے تھے دروازے پر پردے کے نام پر ٹاٹ جھول رہے تھے۔

اس ٹاٹ کو پرے ہٹاتا ہوا ایک مجہول سا بوڑھا کانپتا ہوا باہر نکلا اس کے پچھلی سے ہاتھ کی استخوانی مٹھی میں بیڑی دبی ہوئی تھی۔ وہ اپنے دروازے کے سامنے ایک بیل گاڑی کو کھڑے دیکھ کر ذرا ٹھٹک گیا۔

"چاچا فضل۔۔۔! اسلام علیکم!" محمد وسان نے بیل گاڑی سے اترتے ہوئے اسے سلام کیا۔ نوراں بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ اور کسمسا کر اپنی اجرک کی چادر کو سر پر درست کرنے لگی۔

"بسم اللہ بابا۔۔۔!" چاچا فضل نامی اس بوڑھے نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے جواباً کہا۔ وسان نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"اڑے چھوکرا۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔ محمد وسان۔۔۔ کیسا ہے تو؟"

محمد وسان کے قریب آنے پر چاچا فضل اسے پہچان کر خوشی سے بولا۔ "بس چاچا۔۔۔ اللہ سائیں کا کرم۔۔۔ درمحمد گھر پر ہے کیا؟" وسان نے پوچھا۔ تو چاچا فضل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر سامنے بیٹھی گٹھڑی بنی بیٹھی نوراں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ کون ہے۔۔۔؟ کیا تیری زال (بیوی) ہے۔"

"ہاؤ چاچا! تو نے ٹھیک اندازہ لگایا۔" وسان جلدی سے بولا۔

"تو لے آ۔۔۔ اسے اندر چھوکرا۔۔۔" وہ بولا اور پھر اندر چلا گیا۔

"اڑے او۔۔۔ درمحمد۔۔۔! تیرا دوست آیا ہے ڑے۔۔۔" اس نے بیٹے کو آواز دی تھی۔

"نوراں۔۔۔ نیچے اتر آ۔۔۔ آجا اندر تو بھی۔" وسان نے وہیں دروازے ہی سے اپنی بیوی کو پکارا۔ اور نوراں اسے کچھ ضروری سامان پہلے ہی اندر

لے جانے کی تاکید کرتے ہوئے اپنی بُغچی سنبھالے بیل گاڑی سے اتر آئی۔

فضل چاچا کا گھر زیادہ بڑا نہ تھا بلکہ اس کا تو صحن بھی تنگ تھا اور وہاں بس ایک دودھیلی بھینس نے گھر کر رکھا تھا۔ نیم پختہ اینٹوں کے دو کوٹھری نما کمرے سامنے نظر آرہے تھے۔ صحن میں ایک جھلنگا سی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی اس پر بیٹھ گئے۔ وسان اپنا جست کا صندوقچہ اتار لایا تھا۔ ذرا دیر بعد ایک دوسری کوٹھری سے وسان کا ہم عمر ایک نوجوان آنکھوں کا چیپڑ نکالتا ہوا نمودار ہوا۔ یہ اس کا دوست درمحمد تھا۔ اس نے میلی سی قمیض اور راک (تہبند) باندھ رکھی تھی۔ وسان کو دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوا۔ پھر جلدی سے اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔

"بھلی کرے آیا سنگت!" (خوش آمدید دوست) دونوں دوست بغل گیر ہوئے۔

"یہ میری گھروالی ہے نوراں۔" محمد وسان نے اسے بتایا۔

"بھاجائی۔۔۔ السلام۔" درمحمد نے نوراں کے سر پر روایتی انداز میں اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے اس سے کہا۔ نوراں سر جھکائے خاموش رہی۔ اتنے میں درمحمد کے باپ نے اس سے کہا۔

"پٹ! تو ان دونوں کے لیے مانی ٹکر (روٹی وغیرہ) کا بندوبست کر۔ میں ڈیرے پر جا رہا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ درمحمد اور اس کا باپ دنیا میں اکیلے تھے۔ درمحمد کی ماں کا حال میں ہی انتقال ہوا تھا۔ درمحمد ابھی غیر شادی شدہ تھا البتہ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔

"اچھا سنگت! تم دونوں اندر کوٹھری میں جا کر آرام کرو۔ میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"تو تکلیف نہ کر نوراں کر لے گی۔ تو نے ابھی چاچا کے ساتھ ڈیرے پر جانا ہے تو ہوآ۔"

وسان نے اس سے کہا تو وہ فراخ دلی سے مسکرا کر بولا۔ ''اڑے نہیں سنگت! کیوں بھاجائی کو تکلیف دیتا ہے۔ چل اٹھ اندر جا کر آرام کرو۔ جاؤ شاباش۔''

وسان بے اختیار مسکرایا پھر نوراں کو لیے اندر کوٹھری میں آ گیا۔ یہاں ایک رلی بچھی چارپائیاں دھری تھیں۔ دونوں میاں بیوی ان پر لیٹ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد درمحمد نے وسان کو آواز دی۔ وہ باہر نکلا تو درمحمد کھانے کے برتن لیے کھڑا تھا۔

''یہ لے کھانا حاضر ہے۔ کھا پی کر آرام کرو۔ میں ڈیرے سے جلد لوٹ آؤں گا۔ اور ہاں بھاجائی کو کام نہ کرنے دینا۔ مجھے باورچی خانے کا خوب تجربہ ہے میں سنبھال لوں گا۔ ویسے خیر تو ہے ناں۔'' اس نے آخر میں پوچھ ہی لیا۔ وسان نے اس کے ہاتھوں سے ناشتے کے برتن پکڑتے ہوئے بولا۔

''ہاؤ یار سنگت! بس خیر ہے بھی اور نہیں بھی۔''

''اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا تھا پر تو پریشان نہ ہو۔ میں آتا ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' درمحمد نے تشفی آمیز لہجے میں اس سے کہا اور پھر کام پر چلا گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن کی صبح اندیشناک تفکرات اور وسوسہ انگیز متوحش خیالات سے طلوع ہوئی تھی۔ دونوں بھائی یعنی مٹھل اور احمد بخش بہ ظاہر معمول کے مطابق کھیتوں پر کام کرنے چلے گئے تھے اندر سے وہ دونوں بے چارے ڈرے ہوئے تھے۔ بالخصوص نوراں کا باپ احمد بخش کچھ زیادہ ہی ڈرا سہما ہوا تھا۔ دونوں کے بشروں پر بے نام سے خوف کی کھٹک ہویدا تھی۔ تاہم دونوں اپنے کام میں مصروف ہو گئے اور اس دوران احمد بخش کبھی کبھی اطراف میں ایک متوحش سی بھی نگاہ ڈالتا جا رہا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے صاف لگ رہا تھا جیسے اسے کسی طوفان کی آمد کا اندیشہ ہو اور پھر

وہی ہوا۔ معاً اس کی نگاہ سامنے والے کھیتوں کے درمیان بل کھاتی پگڈنڈی پر پڑی اور وہ بری طرح دہل گیا۔ اس نے ذرا فاصلے پر کام کرتے ہوئے اپنے بھائی مٹھل کو آواز دی۔

''بھا مٹھل ہوشیار۔'' اس کی آواز میں ان جانے خوف کا ارتعاش تھا۔ مٹھل نے بھائی کی آواز پر کٹائی کے دوران سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی اسے مذکورہ پگڈنڈی پر ایک بغیر ہڈ کی جیپ آتی دکھائی دی۔ احمد بخش فوراً اپنے بھائی مٹھل کی طرف کھسک آیا۔ پھر دونوں سہمی ہوئی نظروں سے آتی ہوئی جیپ کو دیکھتے گئے۔ جیپ ان کے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رکی۔ دونوں بھائیوں کے دل بوڑھے سینوں میں لرزنے لگے۔ جیپ سے چار افراد کدا کڑے مار کر اتر آئے۔ وہ چاروں اجرک پوش تھے۔ تین تو خاصے لحیم شحیم تھے جب کہ چوتھا ایک منحنی منشی ٹائپ شخص تھا۔ اس نے الوؤں کے دیدوں جیسی عدسوں والی عینک چڑھا رکھی تھی۔ دو کے کاندھوں پر رائفلیں اور تیسرے لحیم شحیم شخص کے بغل سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ یہ گہرام تھا' زمیندار دریا خان کا خاص الخاص آدمی اور منحنی شخص اس کا منشی موریو خان تھا۔ باقی دو کی حیثیت ان کے کارندوں کی سی تھی۔ گہرام اور منشی سرد نظروں سے باری احمد بخش کی طرف گھورتے ہوئے ان کے قریب آئے تو دونوں بھائیوں نے اپنے ہاتھ جوڑ کر انہیں سلام کیا۔

''اڑے بابا۔۔۔احمد بخش! ہم آخری جواب لینے آئے ہیں تیرے سے اس وقت بول کیا جواب ہے تیرا؟'' گہرام نے خشک لہجے میں اس سے کہا۔

''سائیں! گھر چلو آرام سے اوطاق میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' تو مٹھل جلدی سے عاجزانہ لہجے میں بولا۔

''اڑے چپ کر۔'' منشی موریو خان نے اسے کرخت لہجے میں جھڑکا۔ پھر احمد بخش سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ہاں بابا! پھر کیا کہتا ہے تو۔۔۔۔کیا تجھے یہ رشتہ منظور ہے؟"

"سس۔۔۔سائیں۔۔۔وہ۔۔۔وہ۔۔۔۔بب۔۔۔بات۔"

بے چارے احمد بخش سے خوف کے مارے بولا نہیں جا رہا تھا۔وہ چاروں اسے خشم ناک نظروں سے گھورنے لگے۔احمد بخش نے بہ مشکل اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"سس۔۔۔۔سائیں!۔۔۔مم۔۔۔میں نے پہلے ہی تم لوگوں سے کہا تھا کہ۔۔۔میں نے اپنی دھی (بیٹی) نوراں کی منگنی اپنے بھائی مٹھل کے بیٹے محمد وسان سے کر دی ہے اور۔۔۔اور۔۔۔ان دونوں کی تو۔۔۔اب۔۔۔۔شادی بھی ہو گئی ہے۔"

ہاری احمد بخش کے الفاظ گہرام اور منشی موریو خان کے سر پر بم کی طرح پھٹے تھے۔

"کیا بکواس کرتا ہے تو؟" گہرام نے غیظ ناک لہجے میں چنگار برساتی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

ہاری احمد بخش غریب سہم کر رہ گیا۔مٹھل بھی بے چارہ گہرام کی قہر باری پر تھوک نگل کر رہ گیا۔کیوں کہ اسی لمحے گہرام نے احمد بخش کے ساتھ اس کی طرف بھی ایک خوں خوار نظر ڈالی تھی۔گویا اس نے اپنے بیٹے محمد وسان کی شادی نوراں سے کر کے کوئی بہت بڑا جرم کر ڈالا ہو۔

"احمد بخش!۔۔۔تو نے اچھا نہیں کیا۔" اس بار منشی موریو خان نے ابلتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم پھکو موالی کے لیے نوراں کا سنگ (رشتہ) لینا چاہتے تھے۔پھر تم دونوں نے ایسا کیوں کیا۔" اس بار احمد بخش کی بجائے مٹھل ذرا ہمت کر کے بولا۔

"سس۔۔۔سائیں!۔۔۔ان دونوں کی تو پپ۔۔۔پہلے ہی سے۔۔۔"

"اڑے بس کر۔۔۔میں تو تم دونوں سے بعد میں نمٹوں گا۔پہلے یہ بتا۔۔۔گواہ بننے کی جرأت کس نے کی تھی؟"

گہرام نے آگ اگلتے ہوئے اس سے پوچھا۔وہ دونوں بے چارے سہمے ہوئے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

"چلو منشی۔۔۔!ذرا اس خدا بخش کے پاس چل کر پوچھتے ہیں۔"

ان دونوں کو متذبذب پا کر گہرام نے منشی سے کہا اور پھر وہ دونوں قہر آلود نظروں سے احمد بخش اور مٹھل کو گھورتے جیپ میں جا بیٹھے۔جیپ ایک جھٹکے سے اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

گوٹھ کے پیش امام خدا بخش کا گھر مسجد کے قریب ہی تھا۔وہ ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔اس کی اکلوتی بیٹی۔۔۔مومل دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔خدا بخش نے اسے روکا وہ اس وقت صحن میں بچھی چارپائی پر روٹی کھا رہا تھا۔اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے بہ آواز بلند کہا۔

"صبر کر ذرا۔۔۔میں روٹی کھا کر آتا ہوں۔" مومل واپس رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔۔۔۔وہ ایک سولہ سالہ جوان لڑکی تھی۔اس کی ماں کو فوت ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔دونوں باپ بیٹی کا دنیا میں اللہ کے سوائے کوئی نہ تھا۔خدا بخش نے کھانا کھا کر شکر الحمد للہ کہا اور پھر چارپائی سے اٹھ کر اس نے ناپختہ صحن کے ایک کونے میں ہاتھ دھوئے پھر انہیں پونچھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔دروازہ کھولا تو وہ ذرا چونک سا گیا۔سامنے گہرام اور زمیندار دریا خان کا منشی موریو خان کھڑے تھے۔

"اسلام وعلیکم۔" خدا بخش نے اپنی ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں سلام کیا۔

"محمد وسان اور نوراں کا نکاح تو نے ہی پڑھایا تھا۔" گہرام اس کے سلام کا

جواب دیے بغیر خاصی درشتگی سے بولا۔ تو پیش امام خدا بخش نے بہ آواز بلند کہا۔

"الحمدللہ۔۔۔ یہ نیک سعادت مجھ گناہگار کو ہی نصیب ہوئی تھی۔"

"کتنے روپے اینٹھے تھے تم نے۔۔۔؟" گہرام کے لہجے میں استہزائیہ خوں خواری تھی۔

"روپے نہیں ہدیہ کہو۔۔۔ جو ملا قبول کیا۔" خدا بخش نے بہ دستور تحمل سے جواب دیا۔

"گواہ کتنے تھے اور کون تھے وہ مائی کے لال جنہوں نے یہ جرأت کی۔"

"دل مراد۔۔۔ سائیں داد گواہ تھے۔"

"بس ہم نے یہی پوچھنا تھا۔" یہ کہہ کر گہرام اور منشی واپس لوٹ گئے۔ خدا بخش کے چہرے پر پہلی بار الجھن آمیز تفکر کے تاثرات ابھرے تھے۔

☆......☆......☆

کوئی پون گھنٹے کے بعد دل مراد اور سائیں داد۔۔۔ پیش امام خدا بخش سمیت زمیندار دریا خان کی اوطاق میں موجود تھے۔ ایک قدرے اونچی پشت والے سرکنڈوں کے موڑھے (مونڈھے) پر زمیندار دریا خان اپنی روایتی بھاری بھرکم شخصیت کے ساتھ بڑے "کر" سے براجمان تھا۔ اس کے سر پر سرخ شیشوں کے کام والی ٹوپی اور شانوں پر ہالا کی اصل بیش قیمت اجرک دھری تھی۔ بڑی بڑی خم دار مونچھوں کی طرح اس کی بھنویں بھی خاصی گھنی اور وسمہ لگی ہوئی تھیں۔ وہ درشت نظروں سے ان تینوں کی طرف گھور رہا تھا۔ اور اس کے برابر والے نسبتاً چھوٹے موڑھے پر گہرام بھی براجمان تھا۔ جبکہ منشی موریو خان قریب ہی ایک بڑی سی چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔

پیش امام خدا بخش کے ساتھ کھڑے نکاح کے دونوں گواہ دل مراد اور سائیں داد کے چہروں پر قدرے خوف اور گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ البتہ پیش

امام خدا بخش نارمل انداز میں کھڑا تھا۔

"خدا بخش بیٹھ جاؤ۔" دفعتاً اعصاب شکن خاموشی میں زمیندار دریا خان کی کھرکھراتی آواز ابھری اور خدا بخش خاموشی سے سامنے دھرے ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ جب کہ دل مراد اور سائیں داد کھڑے رہے تھے۔

"خدا بخش! تم بے شک گوٹھ کی ایک معزز شخصیت ہو۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہمارے ہاریوں کے ساتھ اس طرح کی ساز باز کرو۔"

زمیندار دریا خان نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کھرکھراتے لہجے میں شکوہ کیا۔

جواباً خدا بخش نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے متحمل لہجے میں کہا۔ "میں نے ساز باز نہیں کی ہے۔"

"تو پھر یہ چوری چھپے نکاح پڑھوانے کا کیا مطلب ہے یہ تو اخلاقاً اور قانوناً جرم ہے۔"

"بعض حالات میں جب شر یا فساد پھیلنے کا خدشہ ہو تو یہ جائز ہے۔" خدا بخش نے مطمئن لہجے میں کہا۔ دریا خان کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے اندر کے ابال پہ بمشکل قابو پائے ہوئے تھا جس کی غمازی اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے تاثرات سے بہ خوبی ہو رہی تھی۔

"میں فضول تکرار کا عادی نہیں ہوں مولوی۔۔۔!" اس بار زمیندار دریا خان کے لہجے میں تضحیک آمیز نخوت عیاں تھی۔

"اب آگے وہی کرنا ہے جو ہم کہیں گے۔"

"تمہیں شاید علم نہیں کہ ہاری حسین بخش کی بیٹی نوراں کی بات پھکو موالی نامی ایک شخص کے ساتھ چل رہی تھی۔۔۔ مگر احمد بخش نے اپنے بھائی مٹھل کے دباؤ میں آ کر اپنی بیٹی نوراں کا نکاح اپنے بھائی مٹھل کے بیٹے محمد وسان سے کر ڈالا جو

سراسر ایک دھوکا ہے لہذا اب تمہارے پاس دو ہی صورتیں ہیں یا اس نکاح کو فوراً منسوخ کردو یا پھر صاف مکر جاؤ۔"

اپنا خودساختہ فیصلہ مولوی خدا بخش کے سر پر مسلط کر کے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر۔۔۔زمیندار دریا خان فوراً ہی اپنے سامنے ڈرے سہمے کھڑے دل مراد اور سائیں داد سے گونجیلی اور کرخت آواز میں بولا۔

"اور۔۔۔تم دونوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔سن رہے ہو تم دونوں بھی میری بات۔۔۔"

زمیندار دریا خان کے گرجدار لہجے میں موجود خوف کو محسوس کر کے دل مراد اور سائیں داد فوراً اپنے ہاتھ جوڑ کر لجاجت سے بولے۔

"حاضر سائیں وڈا۔۔۔!برابر سائیں وڈا!!۔۔۔جیسا آپ کا حکم ہو۔"

مولوی خدا بخش نے ایک ناگوار سی نگاہ ان دونوں پر ڈالی اور پھر زمیندار دریا خان کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور انتہائی سنجیدگی سے اٹل لہجے میں بولا۔

"معاف کرنا سائیں!۔۔۔میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتا۔۔۔ان دونوں کا نکاح ہو چکا ہے۔اب وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں۔"

مولوی خدا بخش کے حتمی لہجے پر زمیندار دریا خان سمیت۔۔۔گہرام،منشی موریو خان اسے خشمگیں نظروں سے گھورنے لگے۔

پھر زمیندار دریا خان نے خون خوار لہجے میں کہا۔

مولوی۔۔۔!تم جا سکتے ہو۔"مولوی خدا بخش خاموشی سے چلا گیا۔

"تم دونوں اپنی بات پر قائم رہنا اور یہ بھول جانا کہ تم اور وہ مولوی خدا بخش یہاں آئے تھے۔

"برابر سائیں۔۔۔برابر۔۔۔"دل مراد اور سائیں داد نے اپنے مخصوص

جی حضوری والے انداز میں کہا اور پھر جیسے جان بخشی کا پروانہ ملتے ہی چلے گئے۔

"سائیں بھوتار یہ۔۔۔!یہ کیا؟آپ نے اس مولوی کو ایسے ہی آرام سے جانے دے دیا۔"

گہرام نے قدرے حیرت سے پوچھا۔تو زمیندار دریا خان کے بھاری بھرکم اور رعونت بھرے چہرے پر بڑے خوف ناک تاثرات ابھرے پھر۔۔۔اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ رقصاں ہوئی اور وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

"اڑے چھوڑ!توان خرانٹ قسم کے مولویوں کو نہیں جانتا۔۔۔میں نے ان کا بندوبست سوچ لیا ہے۔"

"مگر سائیں!اس کا تو بندوبست ہوتا رہے گا۔۔۔اب ان دونوں چھوری اور چھوکرے (نوراں اور محمد وسان) کا بھی کچھ سوچنا چاہیے ہمیں۔۔۔"منشی موریو خان نے جیسے یاد دلوایا۔

"ہاں۔۔۔اڑے گہرام۔"

"حاضر سائیں۔"

"بابا۔۔۔!تم ایسا کرو۔۔۔ہرل نامی کھوجی کے ہاں جاؤ۔۔۔اسے راز داری میں لے کر ذرا دونوں کے "پیرے" تلاش کرنے کا کہو۔پھر نوراں اور وسان کا سراغ ملتے ہی وسان کو موت کے گھاٹ اتار دو اور چھوکری نوراں کو۔۔۔اٹھا کر لے آؤ۔۔۔تمہارا کام ہو گیا۔"زمیندار دریا خان نے سفاک لہجے میں کہا اور پھر تینوں کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ ابھر آئی۔

☆......☆......☆

حسب معمول۔۔۔سر شام ہی گوٹھ پر رات کی سیاہ چادر تن گئی تھی۔دور کھیتوں اور بنجر ویرانوں کی طرف سے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آنے

لگی تھیں۔۔۔چاچا فضل اپنی کوٹھری میں ذرا دیر تک خشک تمباکو کی گڑ گڑی لگانے کے بعد کھری کھاٹ پر سو چکا تھا۔دوسری کوٹھری میں نوراں اس کا شوہر محمد وسان آمنے سامنے رلی بچھی چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔در محمد وسان کے ساتھ اس کی چار پائی پر بیٹھا تھا۔کوٹھری کے اندر ایک سائبان کے نکڑ پر جھولتی لالٹین کی یرقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔تینوں کے چہرے دم بہ خود خاموشی میں مستغرق تھے۔ان کے گم صم مگر پر سوچ چہروں کے تاثرات سے بہ خوبی اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ۔۔۔ذرا دیر پہلے ان کے درمیان انتہائی سنجیدہ نوعیت کی گفتگو ہوتی رہی ہے اور اب یہ جیسے۔۔۔آئندہ کے کسی لائحہ عمل کے تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے۔ابھی ذرا دیر پہلے ہی محمد وسان۔۔۔اپنے دوست در محمد کو ساری حقیقت سے تفصیلاً آگاہ کر چکا تھا۔

"سنگت۔۔۔!تم دونوں کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔اللہ بہتری کی کوئی نہ کوئی صورت نکالے گا۔"

بالآخر خاصی دیر بعد جب ان مخدوش حالات سے چھٹکارا کی کوئی راہ سجھائی نہ دی تو۔۔۔در محمد نے محمد وسان کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے اس سے ازراہ تشفی کہا۔مگر حقیقت یہ تھی کہ خود وہ بھی محمد وسان اور نوراں کی لرزہ خیز داستان سے پریشان تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ آخر کس طرح ان بے چاروں کی دادرسی کرنے کی کوششیں کر سکتا ہے؟"

"یار در محمد!اللہ ہی کے آسرے پر تو اب تک میں اور نوراں زندہ ہیں۔"بالآخر وسان نے کہا۔

"مگر مجھے خود سے زیادہ۔۔۔بابا لوگوں کی فکر ستا رہی ہے۔کمینہ منشی موریو اور زمیندار دریا خان اور گہرام نے ان بے چاروں کا ناک میں دم کر دیا ہوگا۔"

"اڑے سنگت!بابا اور چاچا والوں کو بس تیرے ساتھ ہی وہ گوٹھ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔۔۔ویسے ہے تو یہ بھی فکر کی بات۔۔۔منشی اور گہرام ان بے چاروں کو خوب

ستا رہے ہوں گے۔"

در محمد نے تاسف سے کہا تو محمد وسان اور بھی بے چین اور متفکر ہو گیا اور یکدم فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"یار در محمد!۔۔۔میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔صبح سویرے جا کر بابا اور چاچا کو میں ادھر ہی لے آؤں گا۔"

"نہیں۔۔۔تو اب وہاں مت جانا۔۔۔وسان!"در محمد نے نفی میں سر ہلا کر بولا۔

"میں اپنے بابا کے ساتھ جاؤں گا۔۔۔اور۔۔۔"

"نہیں چاچا فضل کو ادھر ہی رہنا چاہئے۔۔۔ہم دونوں چلیں گے۔"محمد وسان اس کی بات کاٹ کر اٹل لہجے میں بولا۔

نوراں اپنے شوہر کے فیصلے پر اندر سے پریشان ہو گئی۔مگر بولی کچھ بھی نہیں تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح سویرے ہی در محمد اور وسان نکل پڑے در محمد نے اپنے باپ فضل کو گھر میں ہی نوراں کے پاس رہنے کی تلقین کی تھی۔اس لیے فضل گھر پر ہی موجود تھا اور نوراں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی۔مگر وہ اندر سے جانے کیوں متوحش سی تھی ایک انجانا سا خوف اس کے دل میں گھر کیے ہوئے تھا۔جیسے اب تب میں کوئی قیامت ٹوٹنے والی ہو۔۔۔کہتے ہیں بعض انسانوں کی چھٹی حس بہت طاقت ور ہوتی ہے۔نوراں بھی شاید ایسی ہی عورتوں میں سے تھی۔وہ صحن کے ایک کونے میں رات کے بکھرے پڑے برتن مانجھ رہی تھی کہ اچانک دروازے کو باہر سے کسی نے زور زور سے دھڑ دھڑایا۔چاچا فضل اس وقت حسب معمول کچے صحن کے وسط میں بچھی چار پائی پر بیٹھا گڑ گڑی جمانے میں مصروف تھا،وہ وہیں چار پائی پر مست الست بیٹھا

زور سے کرکرایا۔

"کون ہے بابا۔۔۔! کیا دروازہ توڑو گے۔۔۔آ رہا ہوں۔"

یہ بڑبڑاتا ہوا وہ چارپائی سے اٹھا۔کونے میں برتن دھوتی ہوئی نوراں متوحش سی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ادھر فضل نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔نوراں کے حلق سے بے اختیار ہذیانی چیخ ابل پڑی۔کیونکہ بابا فضل کو زور سے دھکا دیتے ہوئے چار پانچ ڈھاٹا پوش اندر داخل ہوئے تھے۔نوراں۔۔۔کوٹھری کی طرف بھاگی مگر دو ڈھاٹا پوشوں نے اسے راستے میں ہی دبوچ لیا اور ایک نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔بابا فضل نے جو دیکھا تو وہ اپنی تکلیف بھلا کر۔۔۔۔ان پر جھپٹا۔۔۔اس کے بوڑھے وجود میں اچانک ہی عجیب سی طاقت عود کر آئی تھی۔نوراں اس وقت اسے اپنی بیٹی کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔اس نے جھپٹ کر ایک کے ڈھاٹے پر ہاتھ مارا تو وہ کھل گیا۔اور نوراں گہرام کو پہچان کر لرز اٹھی۔

"چھوڑ دے میری دھی (بیٹی) کو۔۔۔ورنہ پورے گوٹھ کو اکٹھا کر لوں گا۔"

"تو زندہ رہے گا تو گوٹھ والوں کو اکٹھا کرے گا نہ بڈھے۔۔۔"

گہرام نے دانت پیس کر کہا اور پھر اپنے نیفے سے خم دار گراری والا چاقو نکال کر بابا فضل کے پیٹ میں گھونپ دیا۔خون کا ایک فوارہ بابا فضل کے پیٹ سے چھوٹا اور پلک جھپکتے ہی کچے صحن میں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔نوراں کی چیخ سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئی اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئی تھیں۔پھر بابا فضل کو خون میں لت پت دیکھ کر وہ گہرام اور اس کے ساتھی ڈھاٹا پوش کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

ذرا ہی دیر بعد گہرام اور اس کے ساتھی بے ہوش نوراں کو باہر کھڑی جیپ میں ڈالے آناً فاناً وہاں سے رفوچکر ہو گئے۔

☆......☆......☆

محمد وسان اور درمحمد کسی طرح چھپتے چھپاتے صبح اپنے مطلوبہ گوٹھ جا پہنچے بوڑھا

مٹھل اپنے بیٹے محمد وسان کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔اس کا بھائی احمد بخش بھی آج کل اپنی بیوی عجیباں کے ساتھ وہیں رہائش پذیر تھا۔دونوں اس وقت کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

"اڑے چھوکرا! تو یہاں آ گیا۔" مٹھل نے خوف زدہ لہجے میں اپنے بیٹے وسان سے کہا۔

"اڑے بابا۔۔۔! نوراں کدھر ہے۔۔۔وہ ٹھیک ہے نا؟"

اس کے سسر احمد بخش نے پریشان ہو کر پوچھا۔تو درمحمد دونوں سے تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

"چاچا۔۔۔تم لوگ فکر نہ کرو بھاجائی نوراں۔۔۔بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"بابا۔۔۔! تم لوگ کیسے ہو۔۔۔اس کمینے گہرام اور منشی موریو خان نے تم لوگوں کو تنگ تو نہیں کیا؟" محمد وسان نے تفکر بھرے لہجے میں پوچھا۔

اثنائے راہ اس کی ماں حیاتاں اور ساس چاچی عجیباں بھی رسوئی سے نکل آئیں۔

"پٹ وسان! تو ہماری فکر نہ کر۔۔۔ہم بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔پر تو بتا حاجی پیارو خان کے پاس گیا تھا یا نہیں۔۔۔؟"

"نہیں بابا۔۔۔! میں اپنے دوست درمحمد کے ہاں ٹھہرا ہوں اور نوراں بھی بالکل خیریت سے ہے وہاں۔۔۔"

"اڑے بابا یہ کیا پھیر کر دیا۔۔۔؟ وہ تو دونوں کو بھوکے کتوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔۔۔" مٹھل یک دم پریشان ہو کر بولا۔

"بابا۔۔۔! آخر ہم کب تک ان بھوکے کتوں سے ڈرتے رہیں گے؟" وسان نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اڑے بھا۔۔۔احمد بخش۔۔۔تو ہی اس چھوکرے کو سمجھا۔۔۔۔کہ یہ یہاں سے چلا جائے۔" بوڑھا مٹھل قریب کھڑے اپنے بھائی سے بولا۔وہ بھی متفکر اور پریشان نظر آرہا تھا۔۔۔۔وسان کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

"پٹ! تو ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھے گا۔۔۔ابھی تو جوان ہے۔۔۔جب تو بھی بچوں والا ہوجائے گا ناں۔۔۔۔پھر تجھے معلوم ہوگا کہ ان کتوں سے ہم کیوں ڈرتے ہیں۔۔۔۔دیکھ ہماری بات مان لے۔۔۔میں تیرا چاچا ہوں سہرا (سسر) بھی۔۔۔تو چلا جا یہاں سے۔۔۔۔"

اس دوران وسان کی ماں حیاتاں اور چاچی ساس بھی روتی ہوئی اس کی منت کرنے لگیں۔

"پٹ وسان! تو چلا جا۔۔۔ہم تجھے اور دھی نوراں کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔"

"مگر۔۔۔تم لوگوں کو میں ان کتوں کے رحم وکرم پر کیسے چھوڑ دوں۔۔۔میری غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی۔"

وسان جھنجھلاہٹ آمیز پریشانی سے بولا تو اس کا باپ مٹھل دوبارہ ملتجی لہجے میں بولا۔

"ارے بابا! ہم بڈھوں کو کوئی کیا کہے گا۔تم زندہ ہو تو ہم بھی زندہ ہیں۔جا چلا جا۔۔۔ہمیں ادھر ہی پڑا رہنے دے۔حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو ہم بھی تمہارے پاس آجائیں گے۔۔۔تم اپنا ٹھکانہ تو بنالو۔"

باپ کی بات سن کر محمد وسان تذبذب کا شکار ہو گیا۔پھر اس کے دوست درمحمد نے بھی وسان کے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"چلو سنگت (دوست)۔۔۔۔! یہ لوگ صحیح کہہ رہے ہیں۔آؤ۔۔۔کہیں ہماری وجہ سے یہ غریب بھی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔"

وسان نے ایک دکھ بھری نگاہ اپنے گھر والوں پر ڈالی اور پھر خاموشی سے واپس لوٹ آیا۔ہاری مٹھل اور احمد بخش نے وسان کو زمیندار دریا خان کے ہاں اپنی طلبی اور گہرام وغیرہ کی دھمکیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

درمحمد وسان کے ساتھ دوبارہ اپنے گوٹھ کی طرف چل دیا۔

جب یہ لوگ گھر پہنچے تو اچانک انہوں نے دیکھا کہ ان کے گھر کے رستے میں لوگوں کا ہجوم تھا۔دونوں پریشان ہو گئے۔پھر دونوں ہی ہجوم کو چیرتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوئے تو دھک سے رہ گئے۔درمحمد کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں بچھی چارپائی پر اس کے باپ فضل کی خون آلود لاش پڑی ہوئی تھی۔جس پر چادر ڈھانپ دی گئی تھی۔

"بابا۔۔۔!" درمحمد دکھ بھری چیخ مار کر باپ کی لاش سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

وسان کی پرتشویش نظریں نوراں کو تلاش کرنے لگیں۔مگر وہ اسے نہ ملی۔تب کسی نے بتایا کہ "کچھ ڈھاٹا پوش افراد ایک بے ہوش جوان عورت کر جیپ میں ڈالے لے گئے ہیں۔پھر جب گوٹھ کے چند لوگ اس کے گھر میں داخل ہوئے تو انہیں۔۔۔چاچا فضل کی صحن میں پڑی خون آلود لاش نظر آئی۔"

یہ سن کر۔۔۔وسان ہکا بکا رہ گیا۔پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں اور اس کی شعلہ فشاں نظروں کے سامنے گہرام کا مکروہ چہرہ رقصاں ہو گیا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ حرکت گہرام کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔اس نے باپ کی لاش پر جھکے روتے ہوئے درمحمد کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور جوش غیظ سے بولا۔

"درمحمد۔۔۔! میں جانتا ہوں یہ حرکت کس نے کی ہے۔۔۔وہ اب میرے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچ سکے گا۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو درمحمد نے جلدی سے کھڑے ہو کر اسے بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

"وسان ---!رک جاؤ۔" وسان کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے---وہ قدرے چونک کر اس کی طرف گھوما۔

"سنگت ---!تیرے سینے میں جو آگ ہے---وہی جوالہ مکھی میرے اندر بھی دہک رہا ہے۔ابھی ٹھہرو---ہمیں جوش کی بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا آؤ---کیا میرے بابا کو کاندھا بھی نہیں دو گے۔" درمحمد کی آواز شدید غم سے رندھ گئی۔

وسان نے ایک گہری سانس لی۔اس کے بعد چاچا فضل کی لاش کی تجہیز و تدفین کی گئی۔اسے گوٹھ کے قریب ہی بیوی کے ساتھ دفنایا گیا تھا۔تعزیت کے لیے آئے ہوئے لوگوں میں سے چند معتبر بوڑھوں نے---محمد وسان اور درمحمد کو متعلقہ تھانے میں فوراً نا معلوم قاتلوں اور اغوا کنندگان کے خلاف رپورٹ کروانے کا مشورہ دیا۔چنانچہ قانونی کارروائی پہلے کرنی پڑی۔اس لیے وہ دونوں مذکورہ چند معتبر لوگوں کے ساتھ متعلقہ تھانے گئے۔یہ تھانہ---محمد وسان اور درمحمد کے گوٹھ کے وسط میں واقع تھا۔اس تھانے میں ان دونوں گوٹھوں کے علاوہ چند دیگر گوٹھوں کی بھی حدود ملتی تھی۔گویا---تھانہ چوحدہ میں واقع تھا۔

ایس ایچ او انسپکٹر خالق داد اس وقت وہیں موجود تھا۔وہ ایک گٹھے ہوئے جسم کا پستہ قامت اور توندیل شخص تھا۔عمر اس کی چالیس پینتالیس کے قریب تھی۔

"ہاں بابا---کیا بات ہے؟" وہ جھٹکے دار لہجے میں ان سب کو گھورنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"سائیں---!ہمارے گوٹھ دیرو گڑھ میں ایک خون اور اغوا کی واردات ہو گئی ہے---" ایک ادھیڑ عمر نے بتایا۔

تو تھانے دار خالق داد یک دم گڑبڑا سا گیا پھر سیدھے ہو کر بیزاری سے بولا

"ارے بابا تو پہلے باہر جا کر ہیڈ محرر کے پاس بیان قلم بند کرواؤ---ایف سی کٹواؤ---پھر اس کے بعد---"

"سائیں یہ ہم سب کر چکے ہیں---اور ایف سی کی بجائے ہم ایف آئی آر کٹوانا چاہتے ہیں۔" محمد وسان تھانے دار خالق داد کے بے اعتنا لہجے پر چڑ کر بولا۔

"ارے چھوکرا---!تو کون ہے اور تیرا مقتول اور مغوی سے کیا تعلق ہے؟" تھانے دار خالق داد خشم ناک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"سائیں ---!وہ مغویہ میری بیوی تھی۔نوراں نام ہے اس کا---اور---جو قتل ہوا ہے---وہ میرے دوست درمحمد کا باپ تھا۔" محمد وسان نے اپنے ساتھ کھڑے درمحمد کے کاندھے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے جواباً کہا۔

اثنائے راہ---ہیڈ محرر محمد بچل بھی اندر آ گیا۔پھر اس نے کیس کی ساری تفصیل اور وسان اور درمحمد کے بارے میں تھانے دار کو بتایا تو تھانے دار خالق داد اس سے بولا۔

"ہاؤ بابا ٹھیک ہے پھر---ایف آئی آر کٹوا دو---اور اگر یہ لوگ مجرموں کا بتا رہے ہیں تو ہو درج کر کے فوراً اے ایس آئی لعل محمد کو اتالی (پولیس پارٹی) سمیت بھیج کر گرفتار کر کے یہاں لے آؤ۔"

"سائیں---!وہ تو ٹھیک ہے پر---" محرر محمد بچل کچھ کہتے کہتے رکا پھر وہاں موجود دو سپاہیوں سے بولا۔

"ان سب کو ذرا باہر برآمدے میں بٹھاؤ۔"

محمد وسان کو ایس ایچ او خالق داد کی یہ بات ناگوار لگی تھی---مگر وہ خاموش رہا---اس کے بعد وہ سب ہیڈ محرر محمد بچل کے ساتھ باہر برآمدے میں آ گئے وہاں دیوار سے دو لکڑی کی بینچیں اور ایک چوکور سیمنٹ کے ستون کے قریب میز کرسی دھری پڑی تھی۔ہیڈ محرر کرسی پر براجمان ہو کر رجسٹر کھولنے لگا---یہ لوگ سب

بینچوں پر بیٹھ گئے۔

"ہاں۔۔۔بابا۔۔۔!مجرموں کے نام بتاؤ۔" ہیڈ محرر نے اپنے کان میں سے اٹکا ہوا بال پوائنٹ پکڑ کر رجسٹر کھولتے ہوئے پوچھا۔تو محمد وسان نے مجرموں کے نام بتاتے ہوئے کہا۔

"لکھو سائیں!ایک تو گہرام اور دوسرا زمیندار دریا خان کا منشی موریو خان اور باقی اس کے ساتھی۔"

"ایں۔۔۔" ہیڈ محرر نے چونک کر سر اٹھایا اور محمد وسان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا تم نے ان کو یہ واردات کرتے ہوئے دیکھا تھا؟" اس کے عجیب و غریب سوال پر محمد وسان ذرا ہکا بکا سا رہ گیا مگر اس کے برابر میں بیٹھے اس کے دوست در محمد نے ہیڈ محرر سے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

"سائیں مجرموں کو واردات کرتے ہوئے ہم کیسے دیکھ سکتے ہیں۔۔۔پولیس بھی تو واردات کے بعد ہی جائے وقوعہ پر پہنچتی ہے۔"

اس کی بات پر ہیڈ محرر محمد بجل نے خشمگیں نظروں سے در محمد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے چھوکرا!جانتا نہیں تو اس وقت کہاں بیٹھا ہے؟"

"اڑے سائیں بجلی صائب!اس میں اتنی گرمی کھانے کی کیا ضرورت ہے۔" ایک معتبر شخص صاحب ڈنو نے ہیڈ محرر سے کہا۔

"جب۔۔۔یہ دونوں چھوکرے۔۔۔ان مجرموں کے بارے بتا رہے ہیں تو آپ پھر لکھو ناں ان کے نام تا کہ انہیں فوراً گرفتار کیا جا سکے۔"

"اڑے بابا۔۔۔میں منشی موریو خان اور گہرام کے نام کسی چشم دید گواہ یا ثبوت کے بغیر کیسے لکھ سکتا ہوں۔۔۔کیا مجھ سے زیادہ تم قانون پڑھے ہوئے

ہو۔" ہیڈ محرر نے اسے گھورا۔

"سائیں۔۔۔!بات قانون پڑھنے یا پڑھوانے کی نہیں ہے۔" ایک دوسرے معتبر شخص نے اسے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہم آپ کو۔۔۔مجرموں کا نام بتا رہے ہیں۔۔۔آپ یہ نام درج کرو۔۔۔تا کہ ان مجرموں کے خلاف کارروائی آگے بڑھ سکے۔"

"میں یہ نام درج نہیں کر سکتا۔" بالآخر ہیڈ محرر نے قلم رکھ دیا۔

"کیوں سائیں؟ یہ لوگ وڈیرے کے آدمی ہیں اس لیے۔"

پختہ العمر صاحب ڈنو نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔"اگر آپ یہ نام درج نہیں کر سکتے تو ٹھیک ہے۔۔۔۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہم شہر کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔۔۔چلو بھئی۔۔۔تم سب نے سن لی ناں۔۔۔اپنے منشی صاحب کی بات۔۔۔"

اس پر ہیڈ محرر ذرا متذبذب سا ہو گیا۔پھر بولا۔

"اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔بیٹھو۔۔۔میں ذرا صاحب سے مل کر آتا ہوں۔"

وہ یہ کہہ کر کرسی سے اٹھا اور انسپکٹر خالق داد صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔پھر ان سب کی نظریں۔۔۔انسپکٹر خالق داد کے کمرے کے دروازے پر جھولتی ہوئی چق پر جم سی گئیں۔ذرا دیر بعد ہی ہیڈ محرر دوبارہ نمودار ہوا اور پھر محمد وسان اور در محمد کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تم دونوں کو صاحب نے بلوایا ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر صاحب ڈنو نے اثبات میں دھیرے سے سر ہلایا تو دونوں اس کا اشارہ سمجھ کر انسپکٹر کے کمرے کی طرف چل دیے۔

"بیٹھو بابا۔۔۔"

ان کے اندر داخل ہوتے ہی انسپکٹر خالق داد نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

دونوں اس کے سامنے دھری کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ انسپکٹر خالق داد
چند منٹ ان کے چہروں کو گھورتا رہا پھر ہولے سے کھنکار کر کھردرے لہجے میں بولا۔
"دیکھو بابا۔۔۔! چونکہ ابھی مجرموں کا صحیح پتہ نہیں لگا ہے۔ میرا مشورہ یہی
ہے کہ بلاوجہ زمیندار دریا خان کے آدمیوں سے الجھنے کی بجائے۔۔۔ فی الحال صرف
نامعلوم مجرموں کے خلاف رپورٹ درج کروا دو۔۔۔ تم بے فکر رہو۔۔۔ اگر مجرم
زمیندار دریا خان کے ہی ہیں تو میں انہیں ضرور گرفتار کروں گا۔"
اس کی بات سن کر۔۔۔ محمد وسان اور در محمد کو اپنی کنپٹیوں پر حیرت انگیز
سائیں سائیں سی ہوتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر
در محمد انسپکٹر سے بولا۔
"انسپکٹر صاحب۔۔۔! میرا بابا قتل ہوا ہے۔۔۔ اور میرے دوست مہمان
کی بیوی اغوا ہو چکی ہے۔۔۔ ہم اپنے دشمنوں کو اچھی طرح جانتے اور پہچانتے
ہیں۔۔۔ اگر آپ۔۔۔ زمیندار دریا خان سے اس قدر خوف زدہ ہیں تو کوئی بات
نہیں۔۔۔ ہم آپ کو تکلیف نہیں دیتے۔ شہر جا کر قانون سے انصاف مانگیں گے۔"
یہ کہہ کر در محمد نے محمد وسان سے کہا۔ "چلو سنگت۔۔۔ لگتا ہے یہاں کے
مجرم پولیس سے زیادہ طاقت رکھتے ہیں۔"
استہزائیہ انداز میں کہے ہوئے اس جملے نے۔۔۔۔۔۔ انسپکٹر خالق داد کو
سلگا دیا۔
"ٹھیک ہے پھر۔۔۔ جوانی کا جوش ہے ناں۔۔۔ اتر جائے گا۔۔۔ یہ
جوش بھی۔" انسپکٹر خالق داد نے سنسناتے لہجے میں کہا۔
"جاؤ پھر۔۔۔ محرر کو نام لکھوا دو ان مجرموں کے۔"
محمد وسان اور در محمد تلخ مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہیڈ محرر بھی
غور سے ان کا چہرہ تکنے لگا۔ جیسے یہ بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو کہ آیا اس کے

"صاحب" کی بات ان دونوں چھوکروں نے مان لی تھی یا نہیں۔
"منشی صاحب۔۔۔! آپ مجرموں کے نام لکھو۔۔۔ منشی۔۔۔ مور یو خان
اور گھرام ولد رکھیو۔" در محمد نے سپاٹ لہجے میں ہیڈ محرر سے کہا۔
ہیڈ محرر ایک بار پھر انسپکٹر کے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔
در محمد نے صاحب ڈنو اور دیگر ہمدردوں کو بتایا کہ اس بدنیت انسپکٹر کی کیا
مرضی ہے۔
ذرا دیر بعد ہیڈ محرر دوبارہ آ گیا اور ان دونوں کی طرف گھورتے ہوئے کرسی
پر بیٹھ گیا۔
مجرموں کے مذکورہ نام لکھے اس کے بعد سب کو چلتا کر دیا۔ محمد وسان اور در محمد
دوسری پریشانی میں گھر گئے تھے۔ پولیس کی کارکردگی سے جو بالکل ہی مایوس کن
تھی۔ تعزیت کرنے والے لوگ رفتہ رفتہ لوٹ رہے تھے۔ فقط صاحب ڈنو اور دیگر
قریبی ہمدرد وہیں بیٹھے رہے تھے۔ انہیں بھی انسپکٹر خالق داد سے مجرموں کے خلاف
کسی قسم کی خاطر خواہ کارروائی کی امید تو نہیں تھی۔
"دیکھتے ہیں۔۔۔ پولیس کیا کرتی ہے۔ ورنہ۔۔۔ یا تو شہر جانا ہو
گا۔۔۔ یا پھر۔۔۔ وڈے سائیں بھوتار سردار۔۔۔ حاجی پیارو خان کے ہاں فریاد
کریں گے۔" صاحب ڈنو نے مشورہ دیا۔
محمد وسان اور در محمد کے چہرے غم و غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔
"میرا خیال ہے۔۔۔ مغرب کے بعد ہمیں دوبارہ تھانے جا کر حالات کا
جائزہ لینا چاہیے۔"
ایک دوسرے ہمدرد نے رائے دی اس کا نام دودا تھا اور وہ صاحب ڈنو کا ہم
عمر تھا۔۔۔ سب نے اس کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے سر ہلا دیے۔
مغرب کی نماز قریبی مسجد میں با جماعت پڑھنے کے بعد۔۔۔ یہ لوگ

تھانے پہنچے تو وہاں سناٹے کا راج تھا۔

حوالات میں چند قیدی سیلن زدہ اور اکھڑے ہوئے پلستر کے ننگے فرش پر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔

دو سپاہی۔۔۔ایک بنچ پر اونگھتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں جگا کر پوچھا گیا تو وہ بولے۔

''ابھی تک کسی کی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ کیوں کہ۔۔۔۔انسپکٹر صاحب کو اچانک آپریشن کے سلسلے میں بھاری جمعیت کے ساتھ جانا پڑ گیا تھا۔''

ان لوگوں کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر مجبور تھے۔ کچھ بولتے تو الٹی آنتیں گلے پڑنے کا ڈر تھا۔ چنانچہ وہ لوگ واپس گھروں کو لوٹ آئے۔

درمحمد اور محمد وسان بھی گھر آ گئے۔

پورا گھر بھائیں۔۔۔بھائیں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ محمد وسان کی دلی کیفیت زیادہ ابتر تھی اسے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ پولیس کی چشم پوشی اور بے اعتنائی نے اسے مایوس کر دیا تھا۔ اس کی جلتی سلگتی آنکھوں کے سامنے بار بار اپنی معصوم اور نو بیاہتا بیوی نوراں کا چہرہ گردش کر رہا تھا۔ جو بار بار اپنی مٹھیاں کھول بھینچ رہا تھا۔۔۔

جانے نوراں بے چاری کس حال میں ہوگی؟ جیسے جیسے سے بیتا جا رہا تھا وسان کے دل و دماغ میں بھیانک اندیشوں اور وسوسوں کے سانپ اسے متواتر ڈسے جا رہے تھے۔ پھر جب غصے اور انتقام کی آگ ناقابل برداشت ہو گئی تو۔۔۔محمد وسان یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور جوش و غیظ سے مغلوب ہو کر کپکپاتے لہجے میں کہا۔

''درمحمد۔۔۔۔! ہمیں انصاف خود ہی لینا ہوگا۔''

درمحمد کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ آخر کو ظالموں نے اس کے بے گناہ باپ کو بے دردی سے قتل کر ڈالا تھا۔

''پولیس الٹا ظالموں کو تحفظ ہی دے گی۔ مظلوموں کو انصاف نہیں۔'' محمد وسان دل کی بھڑاس لفظوں کی صورت میں نکال رہا تھا۔

''ٹھیک ہے سنگت۔۔۔! میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔۔دشمنوں نے میرے باپ کو قتل اور میری بھاجائی (بھابھی) نوراں کو میرے گھر سے اٹھا کر اچھا نہیں کیا۔ جب تک بھاجائی کو چھڑا نہ لیں مجھ پر چین و سکون حرام ہے۔''

بالآخر درمحمد نے بھی اس کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہا اور اس کے بعد دونوں دوست سر بہ سر انتقام بنے ہوئے اپنی کلہاڑیاں سنبھالے رات کی تاریکی میں نکل پڑے۔

☆......☆......☆

نوراں خوف اور صدمے کے باعث بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کی جب دوبارہ آنکھ کھلی تو خود کو ایک پرانے گودام نما کمرے میں پایا۔ جہاں اناج کی بوریوں کے علاوہ چند زنگ آلود زرعی آلات بکھرے ہوئے تھے۔ نوراں ایک جھلنگا سی کھری چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ جلدی سے خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دماغ میں ژولیدہ خیالات کی یلغار ہونے لگی اسے دھیرے دھیرے سب یاد آنے لگا کہ گہرام اور اس کے ساتھی چاچا فضل کو بے دردی سے قتل کرنے کے بعد اسے اغواء کر کے لے آئے تھے۔

اس کا متوحش دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنے شوہر محمد وسان کے بارے میں سوچا کہ اس کی غم و غصے کے مارے کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ اس نے متوحش نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ جہاں صرف بلندی پر ایک روشن دان تھا۔ وہاں سے سورج کی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے اٹھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی وہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے دروازے کی دوسری طرف چند قدموں کی آہٹ ابھری۔ نوراں یک دم۔۔۔دہشت زدہ ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی اور

یوں متوحش نگاہوں سے بند دروازے کو دیکھنے لگی جیسے ابھی کوئی خوف ناک عفریت دروازہ توڑ کے نمودار ہو جائے گا اور پھر وہی ہوا، وہ عفریت دروازہ کھول کر اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ یہ گہرام تھا۔۔۔۔ جواب نوراں کو خونخوار نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ بے چاری نوراں اسے دیکھ کر پہلے تو خوف زدہ ہو گئی مگر۔۔۔۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ جوڑ کر لرزیدہ آواز میں اس کی منت کرتے ہوئے گڑگڑائی۔

''تجھے اللہ سائیں کا واسطہ۔۔۔ مم۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔ مجھ غریب پر یہ ظلم نہ کر۔''

گہرم اس کی داد فریاد پر خبیثانہ مسکراہٹ سے اس کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

''ہماری بات مان لے۔ تجھے چھوڑ دیا جائے گا۔۔۔۔ تجھے میرے بھائی پھکو موالی سے شادی کرنا ہو گی۔''

اس کی بات پر بے چاری نوراں لرز اٹھی۔ ''ی۔۔۔ یہ۔۔۔ کیسے ہو سکتا ہے ۔۔۔ مم۔۔۔ میں تو پہلے سے شادی شدہ ہوں۔''

''وہ شادی نہیں۔۔۔۔ فرار کا بہانہ تھا۔ بس تو پھکو موالی سے شادی پر ہاں کر دے۔ باقی ہم خود سنبھال لیں گے۔''

''نہیں۔۔۔ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔'' نوراں نے کپکپاتے ہوئے کہا تھا کہ گہرام کی آنکھوں میں سفاک چمک نمودار ہوئی۔ اور وہ خونخوار لہجے میں بولا۔

''تو اگر ایسا نہیں کرے گی تو۔۔۔ میں تیرے گھر والوں سمیت' تیرے شوہر محمد وسان کو بھی ختم کر ڈالوں گا۔ تو میری طاقت سے واقف نہیں۔''

''ظالم۔۔۔ اللہ سے ڈر۔۔۔ ایک غریب اور بے کس مجبور لڑکی کے ساتھ یہ ظلم مت کر۔۔۔۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔۔۔ مجھے جانے

دے۔'' نوراں پھر روتے ہوئے گڑگڑائی۔

''جب تک تو میرے بھائی سے شادی کے لیے ہاں نہیں کرے گی۔۔۔ تجھے ادھر ہی مرنا پڑے گا۔''

گہرام یہ کہہ کر واپس چلا گیا اور باہر سے دروازہ بند کرنے کی آواز ابھری۔

نوراں اپنی الم نصیبی پر وہیں کھڑے کھڑے آنسو بہانے لگی۔

☆......☆......☆

محمد وسان اور در محمد سراپا آتش غیظ و انتقام بنے۔۔۔۔ دریا خان کی حویلی کی طرف تاریکی میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کیوں کہ انہیں پورا یقین تھا کہ بد خصلت گہرام۔۔۔ نوراں کو اغوا کر کے اپنے گرو گھنٹال زمیندار دریا خان کی حویلی کی اوطاق میں لایا ہو گا۔ یا پھر کم از کم وہاں۔۔۔ کسی حواری کے ذریعے انہیں گہرام کا پتا معلوم ہو جاتا۔ وہ دونوں ویران اور تاریکی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں کے درمیان زیریں پگڈنڈی پر تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے تھے۔

ہر طرف تاریک سناٹے کا راج تھا۔ آسمان صاف تھا۔ طباق چاند کی روشنی چاروں طرف چٹکی ہوئی تھی۔ دور کہیں آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آواز ابھرتی اور پھر آسیبی سکوت طاری ہو جاتا۔

دور ہی سے انہیں۔۔۔ گارے مٹی والے بے ترتیب گھروں کی قطاریں نظر آنے لگیں۔ دونوں نے اپنا رخ بدلا تو سامنے ہی ذرا فاصلے پر انہیں۔۔۔ حویلی کا خاکہ دکھائی دیا۔ ان کی رفتار تیز ہو گئی وہ۔۔۔ ذرا حویلی کے قریب پہنچ کر مٹی کی گنجان جھاڑیوں کی آڑ میں ہو کر بہ غور حویلی کو گھورنے لگے۔

''سنگت۔۔۔! اوطاق کس طرف ہے؟'' در محمد نے سرسراتی سرگوشی میں پوچھا۔

''حویلی کی پرلی طرف۔۔۔'' محمد وسان نے ہولے سے جواب دیا۔

"چلو پھر۔۔۔اس طرف۔" درمحمد نے سرگوشی کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ۔۔۔حویلی کے عقبی احاطے کے بڑے سے چوبی گیٹ کے دم بہ خود ہیولوں کی طرح کھڑے تھے۔حویلی کے گرد۔۔۔چھ فٹ گارے مٹی کی دیوار تھی۔جس کا رقبہ خاصا وسیع تھا۔اوطاق احاطے کی اندرونی طرف واقع تھا۔دروازہ البتہ بند تھا۔یہاں کوئی پہرے دار یا ذی نفس نظر نہیں آ رہا تھا۔

"سنگت۔۔۔!تو مجھے کاندھا دے۔۔۔میں پہلے اندر کود دوں گا۔" درمحمد بولا۔

"نہیں۔۔۔میں تجھے اکیلا اندر نہیں جانے دوں گا۔میں بھی جاؤں گا تیرے ساتھ۔" محمد وسان نے حتمی لہجے میں کہا۔

"چلو پھر۔۔۔دروازہ ٹاپنے کی کوشش کرتے ہیں۔" درمحمد نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے رضا مندی سے کہا۔پھر دونوں نے اپنی اپنی کلہاڑیاں پشت پر اٹکائیں اور گیٹ کے چوبی دروازے کے ابھرواں رخنوں سے اوپر چڑھنے لگے۔ذرا ہی دیر بعد وہ اندر کود چکے تھے۔

وہ دونوں پھلواری کی ایک طویل باڑ کے عقب میں چند ثانیے دبک کر سامنے مدھم روشنی میں گھورنے لگے۔یہاں مکمل خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔حویلی کی عقبی بلند دیوار بالکل سپاٹ تھی۔ذرا بلندی پر دریچے بھی بند تھے۔بائیں جانب انہیں اوطاق کا دروازہ نظر آیا۔سامنے سرکنڈوں کا چھپر نما سائبان تھا۔وہ گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے محتاط روی سے آگے بڑھنے لگے۔دونوں نے اپنی کلہاڑیاں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔جوش اور غیظ سے بھرے دل و دماغ کے ساتھ وہ بے دھڑک اوطاق کے بند دروازے کے قریب پہنچے تو انہیں اوطاق کے اندر کسی کے زور زور سے آتے ہوئے خراٹوں کی آوازیں سنائی دیں۔دونوں نے ایک نظر ایک دوسرے کے

چہرے کی طرف دیکھا پھر نظروں ہی نظروں میں خاموش پیغام کے تبادلے ہوئے اور۔۔۔محمد وسان نے بے آواز آگے بڑھ کر۔۔۔اوطاق کے دروازے کو پورا اندر کی طرف دھکیلا۔وہ کھلتا چلا گیا۔اندر ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔دونوں غڑاپ سے اندر آ گئے۔سامنے چارپائی پر انہوں نے کسی کو سوتا پایا۔اس اکیلے سوتے ہوئے شخص کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔محمد وسان نے دانت بھینچتے ہوئے اپنی کلہاڑی کے ٹھوکے سے اس سوتے ہوئے کو جگایا۔تو وہ۔۔۔یک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا درمحمد نے فوراً اس کی گردن دبوچ کر اور انگارہ آنکھوں سے اسے گھورا اور بولا۔۔۔

"خبردار۔۔۔!کوئی آواز نکلی تو۔۔۔ورنہ کلہاڑیاں مار کر تیرے ٹوٹے کر دیں گے۔" درمحمد کی دھمکی نے اسے خاموش رہنے کی پر مجبور کر دیا۔

"گہرام کدھر ہے۔" وسان نے درشتی سے پوچھا۔

"مم۔۔۔میں۔۔۔مجھے نہیں معلوم؟" وہ ہکلا کر بولا۔

"بتاتا ہے یا اٹھاؤں کلہاڑی۔۔۔" درمحمد نے اس کی گردن چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی بلند کر لی۔

"بول۔۔۔ورنہ ابھی تجھے خون میں نہلا دوں گا۔"

اس کی خوف ناک دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ لکنت زدہ لہجے میں گھگھیایا اور بولا۔

"گہرا۔۔۔گہرام اپنے ہی گھر میں ہوگا۔" درمحمد نے وسان کی طرف دیکھا وہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بولا۔

"میں نے دیکھا ہے اس کا گھر۔"

پھر زمیندار دریا خان کے حواری سے بولا۔

"تجھے پتا ہوگا۔وہ کمینہ ایک لڑکی کو قریبی گوٹھ سے اٹھا کر لایا ہے۔۔۔اسے کدھر رکھا ہے؟"

"میں ۔۔۔ مجھے بالکل پتا نہیں ۔۔۔ گہرام کو ہی پتا ہوگا۔" جیسے اپنی جان چھڑاتے ہوئے بولا۔

"سنگت ۔۔۔! میرا خیال ہے ہمیں اس حرام زادے گہرام کو پکڑنا چاہیے وہی ہمارا اصل دشمن ہے۔"

"ہاں ۔۔۔ چلو۔" اس کے بعد حواری کو دھمکا کر دوبارہ چادر اوڑھ کر خاموشی سے سوتے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے دونوں یار اوطاق سے باہر نکلے تو ۔۔۔ باہر سے دروازہ بند کر کے وہ تاریک میں گم ہو گئے۔ گہرام کا گھر ۔۔۔ حویلی سے زیادہ دور نہ تھا۔

☆......☆......☆

پختہ اینٹوں والے اس نسبتاً بڑے سے مکان پر تاریکی اور سناٹے کا غلبہ تھا۔ روشن آسمان پر جانے کہاں سے بادلوں کے آوارہ ٹکڑوں نے یلغار کر دی تھی۔ اندر کشادہ صحن ویران تھا۔ معاً صحن کی دیوار پر ایک ہیولہ نمودار ہوا۔ جس کی پشت سے کلہاڑی کا پھل جھانک رہا تھا۔ اس ہیولے نے جو تاریکی کا ہی حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ بغور اندر کا جائزہ لیا۔ مختصر سے برآمدے پر بلب روشن تھا۔ جس کی کمزور یرقان زدہ سی روشنی میں اس پر اسرار ہیولے نے برآمدے سے نظر آنے والے دو کمروں کے دروازے پر نظر ڈالی۔ جو بند تھے۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کے سہارے سے ایک دوسرے اپنے جیسے ہی کلہاڑی بردار کو اوپر دیوار پر کھینچا۔

یہ دونوں ۔۔۔ محمد وسان اور در محمد تھے جو اس وقت گہرام کے مکان کی دیوار پر موت کے بھیانک سائے کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دونوں اندر کود گئے۔

اندر صحن میں کودتے ہی دونوں چند لمحے اپنی جگہ دم سادھے گردوپیش کی سن گن لیتے رہے۔ پھر بیک وقت پھلواری کی اوٹ سے نکل کر ۔۔۔ محتاط رو سے

برآمدے کی طرف بڑھے۔ کمروں کے دونوں دروازے بند تھے۔ یقیناً ان دونوں میں کوئی نہ کوئی ضرور موجود تھا۔ اچانک دونوں برآمدے کی طرف بڑھتے بڑھتے ٹھٹک کر رکے۔ دونوں نے اگرچہ اجرک کے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ مگر انہیں اپنے پہچانے جانے کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ اچانک کھلا تھا۔ سامنے ایک پکی عمر کی عورت جماہیاں لیتی ہوئی نمودار ہوئی۔ وہ شاید اپنے ہی خیال سے کسی ضرورت کے تحت باہر نکلی تھی۔ مگر سامنے ان دونوں کلہاڑی بدست وسان اور در محمد کو دیکھ کر وہ پہلے تو سناٹے میں آ گئی۔ پھر زوردار ہذیانی چیخ مار کر واپس پلٹی اور دروازہ بند کرنے لگی۔ وسان اور در محمد دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ عورت دہشت زدہ ہو کر چارپائی پر ڈھے گئی (بے ہوش ہو گئی) برابر کی چارپائی پر سویا ہوا ایک شخص عورت کی چیخ سن کر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا تو ۔۔۔ وسان نے اسے دبوچ لیا یہ گہرام تھا۔

"خبردار کتے! اگر کوئی آواز نکالی تو ۔۔۔ بول نوراں کدھر ہے۔ ورنہ تجھے خون میں نہلا دیں گے۔"

وسان نے زہرناک لہجے میں اسے شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور گہرام جیسے اپنے مخاطب کو پہچان کر مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں داخل ہونے کی ۔۔۔ میں ۔۔۔" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ در محمد نے اپنی کلہاڑی کا لکڑا اس کی پیشانی پر مارا گہرام کے حلق سے تکلیف کے مارے کراہ آمیز چیخ نکل گئی۔

"کمینے ۔۔۔ کتے ۔۔۔! میرے باپ کا قتل کر کے اکڑ رہا ہے۔ بول بھاجائی (بھابھی) نوراں کو تو نے کدھر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ اس بار کلہاڑی مار کر تیرا سر پھاڑ دوں گا۔"

در محمد کے وحشت خوں رنگ لہجے نے گہرام پر دہشت طاری کر دی۔ اس کی

پیشانی پھٹ گئی جہاں سے سرخ گاڑھا گاڑھا خون اس کے چہرے سے بہہ کر قمیض کو رنگین کر رہا تھا۔

"وہ۔۔۔ مجھے۔۔۔ نہیں معلوم۔" وہ بہ مشکل بولا۔

تو محمد وسان نے اپنی کلہاڑی بلند کر لی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ہم اسے ڈھونڈ ہی لیں گے۔ تو اب نہیں بچ سکتا۔"

"ٹھہرو ٹھہرو۔۔۔ ب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" گہرام ایک دم خوف زدہ ہو کر بولا۔

"دیکھ ہمارے سروں پر اس وقت انتقام کی آگ سوار ہے۔۔۔ تو نے ہم سے اگر ذرا بھی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو۔۔۔۔ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ چل اٹھ۔" درمحمد نے کہا پھر اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا۔

دونوں اسے رگیدتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔ وسان نے کمرے کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد تینوں صحن کے بیرونی دروازے سے باہر نکلے۔۔۔ اور اسے بھی باہر سے کنڈی لگا دی۔ گہرام کی مضروب پیشانی سے اب خوب بہنا بند ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنی اجرک زخم پر رکھ دی تھی۔ گہرام انہیں ساتھ لیے ہوئے گوٹھ سے کوئی دو کلومیٹر دور تاریک ویرانے میں لے آیا۔ سامنے ایک فارم کی سال خوردہ عمارت نظر آ رہی تھی۔ جہاں آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ وہ دونوں بدخصلت گہرام کو دھکیلتے ہوئے فارم کے نزدیک پہنچے۔ تو اس کے آہنی دروازے پر زنگ آلود بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔

"چابی تو گھر پر ہی رہ گئی ہے۔" گہرام عیاری سے بولا۔ مگر وہ دونوں اس کی چالاکی میں آنے والے کب تھے۔ محمد وسان نے زہر آلود نظروں سے اسے گھورا اور پھر۔۔۔ اپنی کلہاڑی کے دو تین وار سے تالا توڑ دیا۔ دروازہ کھول کر بے تابی سے اندر داخل ہوا۔ سامنے حرماں نصیب نوراں کو مضطرب الحال کھڑے پایا۔ اس نے شاید

باہر ابھرنے والی آہٹیں سن لی تھی۔

"نوراں۔۔۔"

"وسان۔۔۔" نوراں یہ کہتی ہوئی بے تابانہ خوشی سے اس کی طرف دوڑی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ معاً باہر گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور ساتھ ہی کسی کی کرب انگیز چیخ سنائی دی۔ وسان چیخ کی یہ آواز فوراً پہچان کر دھک سے رہ گیا۔ یہ آواز اس کے دوست درمحمد کی تھی۔ نوراں بھی بری طرح دہشت زدہ ہو گئی۔

وسان خطرہ بھانپتے ہی۔۔۔ اسے خود سے الگ کر کے دروازے کی طرف مڑا۔۔۔ سامنے اپنے دوست درمحمد کو خون کی چھپڑی میں پڑا پایا۔ ساتھ ہی اس کی نظر سامنے تین رائفل بردار افراد پر پڑی۔ گہرام بھی ان کے ساتھ کھڑا۔۔۔ زمین پر پڑی درمحمد کی خون میں لت پت پڑی لاش کو حقارت و نفرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقیناً اس کے ان تینوں مسلح ساتھیوں نے مار ڈالا تھا۔ جو اچانک کہیں سے نمودار ہو گئے تھے۔

وسان بری طرح گھبرا گیا۔ مگر اس نے اپنے حواس مختل نہ ہونے دیے اور یہ چالاکی کی کہ مڑ کر آگے بڑھ کر گودام کا دروازہ بند کر دیا اور اسے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ نوراں اس کے ساتھ آ لگی۔ وسان اسے لے کر دیوار سے چپک گیا۔ اس کا دل سائیں سائیں کر کے کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ شرارت اوطاق میں سوئے ہوئے اس شخص کی تھی جسے یہ دونوں بند کر کے ادھر آ نکلے تھے اور یہ ہو سکتا تھا اس نے چیخ چلا کر دوسرے ساتھیوں کو بلایا تھا اور اس نے ان دونوں کے عزائم سے باخبر کر دیا تھا۔ وسان کو اپنے دوست درمحمد کے اس بے دردی سے قتل ہونے پر از حد رنج ہوا تھا۔ مگر اب وہ خود بھی بری طرح ان کے جان لیوا حد تک خطرناک حالات کی آغوش میں آ پھنسا تھا۔ اس کے ساتھ نوراں بھی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا ہو گیا؟" نوراں کپکپاتی آواز میں بولی۔

”نوراں ۔۔۔! ہمت سے کام لو۔۔۔ اللہ پر بھروسہ کرو۔“ وسان نے اسے تسلی دی۔ معاً باہر سے گہرام کی درشت آواز ابھری۔

”وسان ۔۔۔! دروازہ کھول کر خود کو ہمارے حوالے کر دو ۔۔۔ ورنہ تم دونوں کا انجام بھی ۔۔۔ تمہارے دوست درمحمد جیسا ہوگا۔“

وسان کے اندر آتش فشاں ابلنے لگا۔ وہ بھانپ چکا تھا کہ ۔۔۔ اس کے مسلح ساتھی کسی وقت بھی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ یوں منہ چھپائے بیٹھے رہنے سے خطرہ مزید گلے پڑ سکتا ہے چنانچہ ۔۔۔ وسان نے ایک انتہائی خطرناک چال چلنے کا سوچا اور پھر نوراں کو ایک طرف کر کے دروازہ کی طرف اپنا منہ لے جا کر بولا۔

”گہرام! میں دروازہ کھول رہا ہوں ۔۔۔ مگر ہماری زندگیوں کی کیا ضمانت ہے؟“

یہ اس نے دانستہ کہا تھا۔ ورنہ تو وہ سمجھ چکا تھا کہ ۔۔۔ وہ اس وقت ویسے ہی گہرام اور اس کے تینوں خونخوار ساتھیوں کے رحم و کرم پر تھا۔

”اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا ۔۔۔ پہلے دروازہ کھولو ۔۔۔“

گہرام کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری اور وسان نے بالآخر ۔۔۔ اپنے منصوبے کے مطابق دروازے کی کنڈی ہٹا دی ۔۔۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا ۔۔۔ طاقت کے رعونت آمیز جوش میں جیسے ہی گہرام کا ایک ساتھی رائفل سنبھالے دروازے پر نمودار ہوا۔ وسان نے پھرتی کے ساتھ اس کی رائفل کی نال پر جھپٹا مارا دوسرے ہی لمحے رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہیں رائفل لٹھ کی طرح گھما کر اس کے سر پر ماری۔ دشمن کے حلق سے کریہہ چیخ نکلی اور اس کا سر کھل گیا بھل بھل خون اس کے پھٹے ہوئے سر سے بہنے لگا۔ باہر موجود اس کے باقی دو مسلح ساتھیوں نے بری طرح ٹھٹک کر فائر کھول دیے۔ وسان یک دم دیوار سے چپک گیا مضروب دشمن کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو چکا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا

تھا۔ وسان نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ڈری سہمی نوراں کو اس نے دیوار کے سہارے خود سے ذرا دور کھڑا کر دیا تھا۔ گولیوں کی خوں ناک بوچھاڑ سے دروازہ اکھڑ کر گر چکا تھا اور ننگی چوکھٹ کے دوسری طرف ۔۔۔ گہرام اور اس کے باقی دونوں ساتھی موت بنے کھڑے تھے۔ وسان دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش مثل لاوے کے سلگ رہی تھی۔

پھر اس کی ٹھٹکی ہوئی سماعت نے سنا۔

”یارو۔ تو چھت پر جا۔۔۔ اور روشن دان سے ان دونوں کا نشانہ لے کر مار ڈال انہیں ۔۔۔ جا بابا تکڑا (جلدی) یہ گہرام کی آواز تھی۔ وسان نے چونک کر روشن دان کی طرف دیکھا۔ وہ خاصی بلندی پر بالکل چھت کے ساتھ تھا۔ یارو نامی گہرام کا ساتھی وہاں پہنچ کر با آسانی ان دونوں کو وہیں سے ہی گولیوں کا نشانہ بنا سکتا تھا۔

مگر ۔۔۔ وسان اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ وہ دونوں موت کے سفاک دہانے پر کھڑے تھے۔ صرف انہیں جھپٹنے کو بے چین تھے۔ اثنائے راہ ۔۔۔ گہرام کی دوبارہ آواز ابھری وہ اپنے دوسرے ساتھی کو ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

”اڑے میرل! اپنی رائفل مجھے دے۔ تو اوطاق کی طرف دوڑ جا ۔۔۔ اور اپنے ساتھیوں کو لے آ ۔۔۔ بھاگ ۔۔۔“

وسان کا دل سائیں ۔۔۔ سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ وہ بے چین ہو گیا گہرام کے ساتھیوں کے یہاں آنے کا مطلب اس کی اور نوراں کی یقینی موت تھا۔ جو کچھ کرنا تھا ابھی کرنا تھا۔ وسان نے بے موت مرنے کی بجائے جنگ کر کے مرنے کو ترجیح دی اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ پھر اس نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ اس نے ایک نگاہ قریب دیوار سے چپکی کھڑی متوحش نوراں کی طرف دیکھا پھر ۔۔۔ اپنی رائفل کو سیدھا کیا اور جبڑے بھینچ کر وہ ننگی چوکھٹ کے سامنے آ گیا اور لبلبی دبادی

گولیوں کی بوچھاڑ اُمڈی ۔۔۔گہرام اسے دیکھتے ہی ایک طرف کو جست لگا چکا تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی جو واپس جانے کے لیے مڑ چکا تھا۔اس کی گولیوں کی زد میں آ گیا اور چیخ مارتے ہوئے گر پڑا۔وسان نے گہرام کا نشانہ لیا۔جو بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس سمے نوراں کی ہذیانی چیخ سنائی دی۔

''وسان۔۔۔!'' وہ ۔۔۔سراپا آتش فشاں بنا پلٹا تو اندر سامنے کی دیوار پر اسے ایک ہیولا دکھائی دیا۔جس کا نصف دھڑ چھت پر تھا اور چمگادڑ کی طرح ۔۔۔الٹا جھول کر۔۔۔روشن دان سے اپنی رائفل کا رخ ان کی طرف کیے ہوئے تھا۔وسان نے اسے فائر کا موقع دیے بغیر وہیں سے اس کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی ۔اس کی رائفل نے ایک طاقت ور برسٹ اگلا اور روشن دان کے باہر الٹے لٹکے یارو نامی گہرام کے دوسرے ساتھی کے حلق سے ایک چیخ خارج ہوئی اور وہ نیچے آ رہا۔

''نوراں۔۔۔! ادھر آ۔۔۔'' وسان نے نوراں کو آواز دی۔وہ لرزتی کانپتی اس کی طرف بڑھی۔

وسان نے ایک ہاتھ سے رائفل سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے نوراں کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔اس نے متلاشی نظروں سے گردو پیش کا جائزہ لیا۔گہرام شاید بھاگ چکا تھا۔وسان نے عمارت کے چاروں طرف طواف کر کے اطمینان کر لیا تھا مگر اسے اپنے اصلی دشمن گہرام کے فرار ہونے پر از حد افسوس ہوا۔اس نے ایک غم زدہ سی نظر اپنے دوست درمحمد کی لاش پر ڈالی۔پھر۔۔۔بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''سنگت۔۔۔تو نے دوست کی خاطر اپنی جان دے دی۔۔۔مگر میں نے تیرے اور تیرے باپ کے دشمنوں کو زندہ نہیں چھوڑا۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے نوراں کا ہاتھ پکڑا اور دونوں تاریکی کی آغوش میں گم ہو گئے۔

☆......☆......☆

محمد وسان اپنی بیوی نوراں کو لے کر اپنے مرحوم دوست درمحمد کے گھر پہنچا۔

نوراں بری طرح خوف زدہ تھی اور سراسیمہ لہجے میں وسان سے بولی۔

''بس۔۔۔سائیں! ہمیں ۔۔۔یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔کہ ۔۔۔کہیں۔۔۔وہ۔۔۔وہ لوگ ادھر نہ آ جائیں۔

''وہ حرام زادہ گہرام اب دوبارہ یہاں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' وسان غصے سے دانت بھینچ کر بولا۔

''ذرا صبح ہو لینے دو۔۔۔میں گوٹھ کے چند لوگوں کے ساتھ۔۔۔تھانے جا کر۔۔۔تمہارا بیان قلم بند کروا دوں گا۔۔۔تا کہ اس بزدل انسپکٹر خالق داد کو بھی حقیقت کا علم ہو سکے۔'' بے چاری نوراں شوہر کے آگے کچھ نہ بول سکی۔محمد وسان کا ارادہ۔۔۔صاحب ڈنو اور اپنے دیگر ہمدردوں کے ساتھ تھانے جانے کا تھا۔

سپیدہ سحر نمودار ہوا تو۔۔۔گوٹھ کی زندگی دھیرے دھیرے بیدار ہونا شروع ہوئی۔وہ دونوں جاگ رہے تھے۔نیند،سکون اور آرام۔۔۔جیسے ان دونوں سے چھن چکا تھا۔وسان نے صاحب ڈنو سمیت دیگر خیر خواہوں کو اکٹھا کیا اور انہیں ساری روداد بتائی۔۔۔وہ سب پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ۔۔۔تھانے کی طرف چل دیے۔ویران اور کچے دھول اڑاتے راستے پر انہیں ایک بغیر ہڈ کی جیپ آتی نظر آئی۔وہ سب بری طرح ٹھٹک گئے۔وسان نے فوراً خطرے کی بو محسوس کی اس نے نوراں کا ہاتھ پکڑا۔دائیں جانب ڈھینگروں کا ڈھیر تھا وہ اسے کھینچتا ہوا۔۔۔ڈھینگروں میں جا گھسا۔اوٹ سے دیکھا تو۔۔۔جیپ قریب آ کر رک چکی تھی۔جیپ سے چار مسلح افراد کدا کڑے مار کر اترے۔وسان ان میں سے گہرام کو پہچان کر پریشان سا ہو گیا۔اگر چہ اپنے بدترین دشمن گہرام کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا مگر۔۔۔وسان جانتا تھا کہ یہ وقت جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کا تھا۔وسان کے ہمدردوں کی تعداد۔۔۔صاحب ڈنو سمیت پانچ تھی۔وہ وسان اور نوراں کے اچانک غائب ہونے پر ذرا نہیں چونکے تھے اور ایک دم انجان بن کر

گہرام اور اس کے تین مسلح آدمیوں کے چہرے دیکھنے لگے۔

"دونوں کدھر گئے تھے۔ابھی تو تمہارے ساتھ تھے۔" معاً گہرام نے درشت لہجے میں صاحب ڈنو سے پوچھا اور۔۔۔شکرے جیسی نظروں سے ڈھینگروں کی طرف دیکھنے لگا۔وسان کو دھڑکا ہوا۔۔۔

"ہمیں نہیں معلوم۔۔۔تم کن دو افراد کی بات کر رہے ہو؟"

صاحب ڈنو نے مرعوب ہوئے بغیر انجان بن کر گہرام سے کہا۔

"او بڈھے۔۔۔!زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کر۔" گہرام دہاڑا پھر باری باری ان سب کو گھورتے ہوئے دھمکی آمیز غراہٹ سے بولا۔

"تم لوگوں نے مل کر میرے خلاف پولیس میں رپورٹ کرنے کی جرأت کیسے کی۔۔۔شرافت سے بتا دو۔۔۔ان دونوں کو کدھر غائب کیا ہے۔۔۔تم لوگوں نے۔۔۔؟"

"اڑے چھوکرا۔۔تمیز سے بات کرو۔" ایک دوسرا خیر خواہ گہرام سے برہم ہو کر بولا۔

"ظلم کی رات تھوڑی ہوتی ہے۔اللہ سے ڈرو۔۔۔" اس کی سرزنش پر گہرام آپے سے باہر ہو گیا۔

تب اس نے اپنے تینوں ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"ان لوگوں کو یہاں سے ہلنے نہ دینا۔۔۔میں ان ڈھینگروں کے پاس جا کر دیکھتا ہوں۔میں نے ان دونوں کو یہاں چھپتے ہوئے دیکھا تھا۔

اب تو وسان کو تشویش لاحق ہونے لگی۔ڈھینگروں کا یہ سلسلہ انتہائی مختصر تھا صاحب ڈنو اور دیگر خیر خواہ بھی گہرام کی بات پر پریشان اور بے چین سے نظر آنے لگے۔گہرام کے تینوں خونخوار ساتھیوں نے اپنی گنوں کا رخ ان کی طرف کر کے گویا انہیں اپنی جگہ ساکت و جامد رہنے پر مجبور کر دیا۔گہرام اپنی گن سنبھالے شکاری

کتے کی طرح وسان اور نوراں کی بو سونگھتا ہوا۔۔۔ڈھینگروں کی طرف بڑھنے لگا وسان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔اس نے نوراں کو بالکل ساکت و خاموش رہنے کی سرگوشیانہ تاکید کی۔پھر جیسے ہی گہرام۔۔۔ذرا قریب آیا۔۔۔وسان یک دم قیامت بن کر اس پر ٹوٹا۔اس نے اچانک ڈھینگروں سے ابھر کر۔۔۔۔گہرام کی رائفل کو دونوں ہاتھوں سے نال کی طرف سے پکڑا اور اس کی مدد سے اس کے سینے پر رائفل کا دستہ مارا۔گہرام اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔اس کے ساتھی بری طرح ٹھٹکے مگر ابھی شاید یا تو کچھ سمجھ نہیں پائے تھے یا پھر فائر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔لیکن ادھر وسان نے گہرام کی چھینی ہوئی رائفل اس کی کنپٹی سے لگا دی۔۔۔اور غرا کر بولا۔

"اپنے کتوں سے بولو ہتھیار پھینک دیں ورنہ تیرا بھیجا اڑا دوں گا۔" وسان کے لہجے کی آتشیں تپش کو محسوس کر کے گہرام نے چلا کر اپنے تینوں ساتھیوں کو ہتھیار پھینک دینے کو کہا۔باقی لوگ دم بہ خود کھڑے رہ گئے تھے۔وسان نے نوراں کو جیپ کے پاس جانے کو کہا اور پھر خود۔۔۔گہرام کو رائفل کی زد پر لیے۔۔۔جیپ کے قریب آیا۔

پھر اسے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا حکم دیا۔گہرام دانت کچکچاتا ہوا جیپ میں سوار ہوا۔وسان نے تینوں کی رائفلوں پر قریب کھڑے اپنے خیر خواہوں کو قبضہ جمانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی انہیں بھی جیپ میں سوار ہونے کو کہا۔

پھر وسان اور نوراں بھی سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئے۔وسان نے رائفل کی نال گہرام کی گردن پر ٹکا کر اسے تھانے چلنے کا درشت حکم دیا۔گہرام نے جیپ اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ذرا دیر بعد وہ لوگ تھانے میں تھے۔انسپکٹر خالق اور ہیڈ محرر وہیں موجود تھے۔گہرام کو دیکھ کر انسپکٹر خالق داد بری طرح چونک گیا۔وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔البتہ گہرام کے خبیث چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ رقصاں

تھی۔گویا وہ تھانہ۔۔۔نہیں۔۔۔بلکہ محفوظ پناہ گاہ میں آ گیا ہوں۔

وسان اور اس کے خیر خواہ صاحب ڈنو وغیرہ نے انسپکٹر خالق داد کو ساری روداد بیان کر دی اور ساتھ ہی نوراں کا بیان بھی ریکارڈ کروا دیا۔ضابطے کی کارروائی نمٹانے کے بعد انسپکٹر خالق داد نے وہاں موجود سپاہیوں سے انہیں لاک اپ کرنے کا حکم دیا۔اس کے بعد یہ لوگ گھر واپس آ گئے۔گہرام کی گرفتاری کے بعد محمد وسان خود کو بالکل ہلکا پھلکا سمجھنے لگا۔وہ نوراں کو دیکھ کر فکر مند ہو گئے اور جب وسان نے اپنے باپ مٹھل اور چاچا (سسر) احمد بخش کو گہرام کی گرفتاری کا بتایا تو خلاف توقع وہ لوگ اور بھی پریشان ہو گئے۔وسان اچنبھا ہوا۔

''برا اچھا نہیں ہوا۔۔۔پٹ وسان۔۔۔!یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔۔۔''اس کا بوڑھا باپ ہاری مٹھل از حد پریشانی سے بولا۔اس کی بوڑھی اور جہاندیدہ آنکھوں میں ایکا ایکی بے نام سی سراسیمگی اور تشویش اتر آئی۔

وسان نے حیرت سے کہا۔''بابا۔۔۔یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔۔۔اس حرام زادے گہرام نے میرے دوست درمحمد اور اس کے بوڑھے باپ کا خون کیا۔میری بیوی نوراں کو اغوا کر کے اس پر اپنے بھائی پھکو موالی سے زبردستی شادی کے لیے دباؤ ڈالا۔۔۔اور۔۔۔اور میں نے اس ذلیل گہرام کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے تو۔۔۔میں نے اچھا نہیں کیا؟''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔تو نے اچھا نہیں کیا وسان۔۔۔!اچھا نہیں کیا،تیری اس بہادری کی سزا اب ہم سب کو ہی بھگتنا پڑے گی۔''اس بار اس کے سسر یعنی نوراں کے بوڑھے باپ احمد بخش نے انتہائی تشویش آمیز تولیدگی سے کہا۔مگر وسان نے دانت بھینچ کر اٹل لہجے میں کہا۔

''میں نے جو ٹھیک کیا ہے۔۔۔یہ شکر کرو۔۔۔کہ اس حرام زادے کا خون نہیں کیا۔۔۔اور اسے پولیس کے حوالے کر آیا۔وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔۔۔بلکہ

۔۔۔بلکہ۔۔۔تم سب کو خوش ہونا چاہیے کہ۔۔۔''

''اڑے چھوکرا۔۔۔تو کس دنیا میں رہ رہا ہے۔۔۔پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑے گی۔الٹا اب ہم پر قیامت ٹوٹنے والی ہے۔''مٹھل نے اس کی بات کاٹ کر روہانسے لہجے میں کہا۔

اس کے لرزیدہ لہجے میں گویا برسوں کا تجربہ پنہاں تھا۔وسان گومگو کھڑا تھا احمد بخش وسان کی منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھ پٹ۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔چلا جا۔۔۔نوراں کو لے کر۔۔۔سائیں پیارو خان کے پاس چلا جا۔۔۔کہیں بھی چلا جا۔۔۔اپنی اور نوراں کی زندگی کا خیال کر۔۔۔''

وسان بری طرح جھنجھلا کر رہ گیا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کے ماں باپ اور سسر کو ایسا کون سا خوف کھائے ہوئے تھا۔وسان نے اٹل لہجے میں جانے سے صاف انکار کر دیا۔بلکہ یہ دھمکی بھی دے ڈالی۔

''کر۔۔۔اگر۔۔۔تم لوگ ہم سے اتنے ہی بیزار ہو گئے ہو تو ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔مگر اس گوٹھ سے اب کسی صورت بھی نہیں نکلیں گے۔''

وسان کے لہجے کی غیرت آمیز حمیت نے دونوں بوڑھوں کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔بہ ظاہر یہ سب کچھ ٹھیک تھا۔۔۔مگر اس ''ٹھیک'' کے پیچھے ایک نادیدہ طوفان کروٹیں لے رہا تھا جس کا وسان کو نہیں تو مٹھل اور احمد بخش کو ضرور علم تھا۔۔۔دونوں بھائیوں نے ایک روز سر جوڑ کر فیصلہ کیا کہ۔۔۔وہ سب لوگ یہ گوٹھ چھوڑ کر وڈیرے پیارو خان کی جاگیر کی طرف ہجرت کر جائیں گے۔۔۔جب انہوں نے اپنا یہ عندیہ وسان کے سامنے پیش کیا تو وسان تھوڑی دیر پرسوچ خاموشی میں مستغرق ہو گیا۔درحقیقت اس کا بھی اب اس جبر و استبداد کی دھرتی سے دل میلا ہو گیا تھا۔وہ یہاں سے ہجرت کرنے پر راضی تو تھا مگر۔۔۔کسی دوسرے گوٹھ کی بجائے

وہ۔۔۔شہر ہی جا کر رہنے کو ترجیح دینا چاہتا تھا۔اس کی بات پر مٹھل بولا۔

"اڑے پٹ۔۔۔ہمیں تو دھا کی (کھیت مزدوری) کے سوا اور کچھ نہیں آتا شہر جا کر کیا کریں گے؟"

"بابا۔۔۔کرلیں گے کچھ نہ کچھ۔۔۔میرے ہوتے ہوئے بھلا تم لوگ کیوں پریشان ہوتے ہو۔۔۔وہاں ہمیں کوئی نہ کوئی مزدوری کا کام مل ہی جائے گا۔"

بالآخر دونوں بوڑھوں نے۔۔۔وسان کی بات پر صاد کیا۔

☆......☆......☆

یہ گہرام کو گرفتار ہوئے دوسرا دن تھا۔انہوں نے بیل گاڑیاں تیار کیں اور شہر روانہ ہونے کے لیے انہوں نے علی الصباح کا انتخاب کیا تھا۔چنانچہ صبح ان لوگوں نے اپنی بیل گاڑیوں میں ضروری سامان رکھا۔۔۔جو چند بوسیدہ بقچیوں اور ٹوٹے پھوٹے کنستروں جیسے ٹرنکوں پر مشتمل تھا۔جب یہ روانہ ہونے لگے تو اچانک وسان کو ایک شخص تیز تیز قدموں سے ان کی طرف آتا دکھائی دیا پھر دوسرے ہی لمحے اسے پہچان کر بری طرح ٹھٹک گیا۔اس کا ہمدرد۔۔۔صاحب ڈنو تھا۔

اس نے قریب آتے ہی پہلے تو حیران کن نظروں سے بھری پری بیل گاڑیوں کو دیکھا پھر جیسے ساری بات اسے سمجھ میں آ گئی اور تب اس نے وسان کو ایک چونکا دینے والی اطلاع دی کہ رذیل صفت گہرام تھانے سے رہا ہو گیا ہے۔

"یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیسے ہوا؟" وسان نے لکنت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"وڈیرے دریا خان نے اپنی ضمانت پر اسے رہا کروایا ہے۔" صاحب ڈنو نے جواب دیا۔

وسان کے ساتھ۔۔۔اس کا باپ مٹھل اور سسر چاچے احمد بخش کے چہروں پر بھی گہری تشویش آمیز تفکیر پھیل گئی۔تاہم صاحب ڈنو نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا

کہ ان کا گوٹھ چھوڑنے کا فیصلہ درست ہے۔وسان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔گہرام اس کا مجرم تھا۔وہ اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔اپنی بے عزتی کا بھی اور اپنے وفادار دوست درمحمد اور اس کے بوڑھے باپ کے قتل کا بھی۔۔۔مگر اس وقت اس کے سر پر بھاری ذمے داری تھی۔۔۔وہ اس کے بوڑھے۔۔۔ماں باپ تھے۔وہ اب تک انہی کی وجہ سے کھل کر اپنے بدترین دشمن گہرام سے جنگ نہیں کر سکا تھا۔اسے وڈیرے دریا خان پر بھی غصہ آ رہا تھا۔وسان کا جی چاہا کہ اس وقت جا کر گہرام کی گردن مروڑ ڈالے۔۔۔وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور چاچے چاچی اور نوراں کے تحفظ کو یقینی بنائے گا۔انہیں پہلے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانے کے بعد۔۔۔وہ۔۔۔گہرام سے گن گن کر بدلے لے گا۔جس نے ان کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔

دونوں بیل گاڑیاں آگے پیچھے' کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی نما بل کھاتے دھول اڑاتے کچے رستے پر چل رہی تھیں۔سب سے آگے۔۔۔وسان اور اس کے خاندان کی بیل گاڑی تھی۔پیچھے چاچا احمد بخش وغیرہ کی بیل گاڑی تھی۔بیل گاڑیوں کے چوبی بدہیئت پہیوں کی چوں۔۔۔چوں۔۔۔چک۔۔۔چوں۔۔۔کی مخصوص افسانوی آواز۔۔۔گوٹھ کی اس صبح سحر خیز فضا میں عجیب طلسم پیدا کر رہی تھی۔مگر اس وقت یہ افسانوی آواز۔۔۔ان حرماں نصیبوں اور ہجرت زدہ آئندہ درگاہ لوگوں کے لیے مجبور دلوں پر چھریاں چلا رہی تھیں۔کسی بھی لمحے کسی چھپے ہوئے طوفان کے اچانک امڈ آنے والے متوقع اور اندیشناک احساس تلے۔۔۔ان کے دل و دماغ بری طرح ٹھٹکے ہوئے تھے۔وسان کے چہرے پر پُر اعصاب خاموشی طاری تھی۔صاحب ڈنو کی اس اطلاع نے اسے بری طرح اعصاب زدہ کر دیا تھا کہ گہرام کو پولیس نے زمیندار دریا خان کی ضمانت پر رہا کر دیا تھا۔گویا۔۔۔دوسری صورت میں گہرام جیسے سفاک شخص کو۔۔۔کھل کر خوفناک بربریت پھیلانے کا دونوں طرف سے ٹھیکا مل چکا

تھا۔وسان کو یہ جاں گسل خدشہ لاحق تھا کہ۔۔۔گہرام اب کسی بھی لمحے زخم کھائے وحشی درندے کی مانند۔۔۔نمودار ہوسکتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ۔۔۔وسان نے اس کی خون آمیز بربریت کا اس انداز میں جواب دینے کے لیے۔۔۔اس سے اس کے تینوں ساتھیوں سے چھینی ہوئی گنیں اب تک اپنے قبضے میں کر رکھی تھیں۔البتہ تین گنوں کے گولیوں سے بھرے ہوئے میگزین اپنے قبضے میں اڑسے ہوئے تھے اور خالی رائفلیں پھینک دی تھیں۔جبکہ گہرام والی رائفل اس نے اپنے قریب ہی بیل گاڑی کے چوبی تختے والے فرش پر بکھری پیال کے نیچے چھپا رکھی تھی۔

دونوں بیل گاڑیاں درمیانی رفتار سے دوڑی جارہی تھیں۔عقب میں آبادی کے آثار معدوم ہونے لگے تھے۔کھیتوں کے سلسلے بھی عبور کرآئے تھے۔اب وہ ایک چھدری چھدری جھاڑیوں والے بڑے سے میدان سے گزر رہے تھے۔وسان کے اعصاب جو کسی بھی لمحے متوقع مخدوش حالات کے باعث تنے ہوئے تھے اب قدرے ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔۔۔مگر اس کا مطلب بہرحال یہ نہ تھا کہ خطرے سے ٹل گیا تھا۔۔۔ذرا دیر میں میدان بھی عبور ہوگیا۔اب میدان سے نکلتا ہوا بل کھاتا کچا راستہ۔۔۔سامنے۔۔۔نظر آنے والے۔۔۔خودرو جھاڑیوں کے گنجان جھنگر میں گم ہورہا تھا۔یہاں جھاڑیاں قدآدم تھیں۔دونوں بیل گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی اس گنجان جھنگر میں داخل ہوگئیں۔

شہر جانے والی پکی سڑک۔۔۔ابھی۔۔۔کچے کے اس ویران علاقے سے لگ بھگ کوئی چار پانچ کلومیٹر دور ہی تھی۔۔۔وہاں سے شہر۔۔۔پورے پندرہ کلومیٹر کی مسافت پر تھا اور وسان کی کوشش بھی یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد کم از کم اس پکی سڑک تک پہنچ جائے۔

قدآدم جھاڑیوں کا گنجان سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ابھی انہوں نے بہ مشکل تھوڑا ہی فیصلہ طے کیا ہوگا کہ معاً ہی دائیں بائیں کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ

ابھری۔۔۔اور پھر اگلے ہی لمحے۔۔۔آٹھ دس گن بردار افراد۔۔۔۔۔ان جھاڑیوں سے ابھر کر۔۔۔ان کا راستہ روکے کھڑے ہوگئے۔انہوں نے گھبرا کر بیلوں کی رسی کھینچ لی۔بیل السائی ہوئی آواز میں ڈکرا کر رک گئے۔۔۔وسان کی کنپٹیوں پر آتش فشاں پھٹنے لگے تھے اور آنکھوں کے سامنے سرخ آندھیاں چلنے لگیں۔۔۔کیوں کہ اس نے۔۔۔ان گن برداروں کے درمیان میں اپنے بدترین دشمن گہرام کو پہچان لیا تھا۔جو مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کو گھورے جارہا تھا۔اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کا کینہ ابھرا ہوا تھا۔بے چاری نوراں بھی اس مخدوش صورت حال سے لرز اٹھی۔۔۔احمد بخش اور مٹھل وغیرہ جہاں کے تہاں۔۔۔بیلوں کی رسی تھامے خوف زدہ سے ان گن برداروں کو تکے جارہے تھے۔

''وسان۔۔۔!بابا تیرا کھیل ختم ہوگیا۔۔۔نوراں کو اب ہمارے حوالے کر دے۔'' گہرام نے مسکراتے ہوئے وسان کو گھورتے ہوئے کہا۔تو وسان کا مارے غیظ و جوش سے دماغ الٹنے لگا۔اس نے پھرتی کے ساتھ۔۔۔پیال کے نیچے سے اپنی رائفل نکال کر گہرام پر تان لی اور غرا کر وحشت لہورنگ لہجے میں بولا۔

''ذلیل کتے!اب اگر تو نے دوبارہ اپنی گندی زبان سے میری بیوی کا نام لیا تو۔۔۔تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔ہٹ جا ہمارے راستے سے۔۔۔ورنہ چھلنی کر کے رکھ دوں گا تجھے۔۔۔''

اس کی للکار پر گہرام کے چہرے پر سناٹے اتر آئے اور سنسنی خیز نظروں سے وسان کو گھورنے لگا۔اس کے ساتھ کھڑے مسلح ساتھیوں کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک اتر آئی۔

بے چاری نوراں اور دونوں بوڑھے ماں باپ مارے دہشت کے لرزہ براندام تھے۔

''اڑے۔۔۔لگتا ہے تجھے اپنی زندگی سے ہی نہیں اپنے بوڑھے ماں باپ

کی زندگی سے بھی پیار نہیں ہے۔'' گہرام نے سنسناتی آواز میں کہا۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔۔۔نوراں کو۔۔۔'' ابھی اس بدخصلت نے اتنا ہی کہا تھا کہ وسان نے غصے سے دانت پیس کر اپنے ہاتھوں میں پکڑی رائفل کی لبلبی دبادی۔گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ فضا میں بلند ہوئی۔۔۔مگر اس سے پہلے ہی گہرام نے شاید وسان کی یہ خونناک جنبش بھانپ لی تھی اس لئے وہ فوراً زمین پر گر گیا تھا۔باقی اس کے عقب میں ساتھ کھڑے آٹھ دس گن بردار ساتھیوں میں تین وسان کی گولیوں کا نشانہ بن کر چیخ مار کر ڈھیر ہوتے چلے گئے۔

باقیوں نے گہرام کی تقلید میں زمین پر گرتے ہی۔۔۔بیل گاڑیوں پر اپنے ہتھیاروں کے آہنی دہانے کھول کر رکھ دیے۔وسان خطرہ بھانپتے ہی۔۔۔نوراں سمیت بیل گاڑی سے چھلانگ لگا کر قریب کی جھاڑیوں میں جا گرا۔

فضاء میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ جاری تھی۔اس کے ساتھ ہی بیلوں کے ڈکرانے کے علاوہ وسان اور نوراں کی سماعتوں میں اپنے بوڑھے ماں باپ کی چیخیں بھی سنائی دیں۔نوراں کے حلق سے مارے شدتِ غم کے چیخ بلند ہونے لگی تھی۔وسان کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے اپنے اور نوراں کے بوڑھے ماں باپ کو خون کی چھپڑی میں پڑے پایا تو۔۔۔اس کے اندر ایکا ایکی آتش فشاں سلگ اٹھا تھا۔۔۔اس نے ایک للکار زدہ دھاڑ ماری اور۔۔۔رائفل کا رخ زمین پر لیٹے گہرام اور اس کے ساتھیوں کی طرف لبلبی دبادی۔دوسری ہی لمحے گہرام کے مزید چار ساتھی خاک وخون میں لوٹنے لگے۔ایک گولی گہرام کے بازو میں بھی لگی۔وہ تڑپ کر۔۔۔لوٹ لگاتا ہوا اپنے بائیں جانب کی جھاڑیوں میں سرک گیا۔اس کے باقی بچے کھچے تینوں ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

اب دونوں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔بیل خوف زدہ ہو کر دوڑ کر لگا چکے تھے۔فضا گولیوں کی گھن گرج سے گونج رہی تھی۔وسان ان کے مقابلے میں تنہا

اور وہ چار تھے۔اگرچہ گہرام زخمی تھا۔مگر پھر بھی اسے وسان پر برتری حاصل تھی۔

وسان۔۔۔اپنے دفاع میں فائرنگ کرتا ہوا۔قدِ آدم جھاڑیوں کے اندر ہی اندر اپنی جگہ بھی تیزی سے بدل رہا تھا۔نوراں اس کے ساتھ تھی۔اس نے خالی میگزین نکال کر پھینکا اور دوسرا اٹیچ کیا۔

اب اس کے پاس صرف دو فاضل میگزین بچے تھے۔وسان کا سینہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے لرزہ خیز انجام پر دکھ سے بھرا ہوا تھا۔نوراں بھی اپنے ماں کی موت پر غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔مگر اس وقت ان دونوں حالات کے ستائے ہوئے حرماں نصیبوں کو اپنی جان کے بھی لالے پڑے ہوئے تھے۔

وسان بڑی جواں مردی کے ساتھ۔۔۔اپنے چاروں دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا تھا۔وہ خود سے زیادہ نوراں کا دفاع بھی کر رہا تھا۔۔۔دشمنوں پر گولیاں برساتا ہوا۔۔۔تیزی سے اپنی جگہ بھی تبدیل کرتا جا رہا تھا۔اچانک دشمنوں کی جانب سے فائرنگ بند ہوگئی۔وسان بھی رک گیا۔ماحول میں تابڑ توڑ گھن گرج کے بعد ایکا ایکی ٹھٹکا ہوا سناٹا چھا گیا۔وسان کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔اس نے دشمنوں کی طرف سے اس ''مکارانہ'' خاموشی کو ان کی چال پر محمول کیا۔وہ سمجھ گیا کہ۔۔۔وہ چاروں ان دونوں کو مختلف سمتوں سے گھیرنے کی کوشش میں مصروف کار ہو سکتے ہیں لہٰذا۔۔۔وہ پہلے سے ہی محتاط ہو گیا۔

وہ نوراں کو کسی محفوظ جگہ دبکانا چاہتا تھا۔ورنہ نوراں کسی بھی وقت اس کی کمزوری کا باعث بن سکتی تھی اس نے متلاشی نظروں سے جھاڑیوں میں دبکے ہوئے بغور اپنے گردوپیش دیکھا۔اسے اپنی دائیں جانب ذرا فاصلے پر۔۔۔ایک کھوہ نظر آئی۔یہ تو شاید۔۔۔گیدڑوں کا کوئی بھٹ تھا۔وہ نوراں کا ہاتھ پکڑے تیزی سے اس طرف رینگ گیا پھر یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اندر سے خالی ہے۔اس نے نوراں کو سکڑ سمٹ کر اندر سما جانے کو کہا۔وہ بے چاری۔۔۔فوراً کھوہ کے اندر سمٹ کر بیٹھ گئی

وسان نے کھوہ کے دہانے پر جلدی جلدی خشک جھاڑیوں کا ڈھیر سرکا دیا۔ پھر بہ سرعت ایک طرف رینگ گیا۔ اب وہ ٹھٹکے ہوئے جنگلی بلے کی طرح سرتاپا سماعت بنا جھاڑیوں کی اوٹ میں دبکا چاروں طرف کی سن گن یا کسی آہٹ پر چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"معاً۔۔۔اسے اپنے عقب میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا۔ گہرام کا ایک ساتھی۔۔۔اس پر فائر کرنے کیلئے پر تول رہا تھا۔ وسان نے تیزی سے پلٹنے کے دوران یہ عقل مندی کی تھی کہ اس نے ایک ہاتھ سے مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا نما پتھر اٹھا لیا تھا۔ اور پلٹتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ کچا پتھر دشمن کے چہرے پر رسید کر دیا۔ اس نے لبلبی دبا دی۔ ٹھٹکی ہوئی دم بہ خود فضا میں برسٹ چلنے کی سمع خراش آواز ابھری۔ اور وسان کو اپنے چہرے کے بالکل قریب سے گولیوں کی مہیب باڑ کی سفاک "جھپک" محسوس ہوئی۔ اگر دشمن کا نشانہ خطا نہ جاتا تو۔۔۔اس کی برسائی ہوئی گولیوں سے وسان کا چہرہ ہی اڑ جاتا۔ اب وسان کو اپنی رائفل چلانے کا موقع مل چکا تھا۔ اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ دشمن مکروہ چیخ کے ساتھ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا تو اچانک اس پر کسی نے چھلانگ لگا دی۔ یہ حملہ اس کیلئے غیر متوقع تھا۔ نتیجتاً۔۔۔ایک لمحے کو وہ بوکھلا گیا۔ مگر اپنے مختل پڑتے حواسوں کو بحال رکھتے ہوئے۔۔۔اس نے اپنی رائفل پر ڈھیلی پڑتی گرفت مضبوطی سے جمائی اور تیزی سے زمین پر لیٹے لیٹے لوٹ لگائی۔۔۔حملہ آور نے اپنی رائفل کا کندہ بٹ اس کے سر پر مارنے کی کوشش کی تھی جو وسان کے سر پر تو نہ لگی البتہ اس کے کاندھے پر اس کی بھرپور ضرب پڑی۔ درد کی ایک تیز سنسناتی لہر اس کے پورے مضروب وجود میں سرایت کرتی چلی گئی۔ مگر یہ وقت اپنی چوٹ سہلانے کا نہ تھا۔ اس نے اپنے جبڑے بھینچتے ہوئے کراہتی ہوئی تکلیف پر قابو پانے کی کوشش کی اور حملہ آور کی ناک پر موقع تاک کر ایک گھونسا جڑ دیا۔ حملہ آور کے حلق سے اذیت ناک کراہ خارج ہو گئی۔۔۔ اس کی ناک پچک گئی تھی۔ وہاں سے بھل بھل خون جاری ہو گیا۔ وسان نے اسے

سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اپنی رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمایا۔ زخمی حملہ آور کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ وہ تیورا کر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ وسان اپنے کاندھے کا درد سہلاتا ہوا۔۔۔اٹھ کھڑا ہوا۔ صبح کی سحر خیزی اب ابھرتے سورج کی تیز روشنی میں بدلنے لگی تھی۔ اس روشنی میں بالکل سامنے۔۔۔چند گز کے فاصلے پر اس نے کسی کو ابھرتے دیکھا۔۔۔وسان کے پاس اس پر فائر کرنے کا وقت نہ تھا۔ کیونکہ۔۔۔اس نے ابھرتے ہی بلا کی پھرتی کے ساتھ اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کیا تھا۔ وسان پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں میں جھک گیا اور تیزی سے ایک طرف کو رینگ گیا۔ دشمن کی طرف سے داغی ہوئی گولیوں کا برسٹ عین اسی جگہ "تارٹ" کی آواز سے پڑا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے۔۔۔وسان موجود تھا۔ وسان نے بھربھری مٹی والی جھنڈ دار زمین پر لیٹے لیٹے جھاڑیوں کے چھدرے روزنوں سے دشمن کا خاکہ دیکھا۔۔۔اور نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ اس کی رائفل سے گولیوں کی پوری خوں ناک باڑ اگلی اور دشمن ایک مکروہ چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

"وسان! رائفل پھینک دے۔۔۔ورنہ نوراں کو گولی مار دوں گا۔"

قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی للکار اس کی سماعتوں سے ٹکرائی اور وسان نے پلٹ کر عقب میں دیکھا تو جیسے پتھر کا بت بنا رہ گیا۔ گہرام نے اس کی بیوی نوراں کو دبوچ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سفاکی چمک ہلکورے لے رہی تھی۔ بے چاری نوراں کا چہرہ خوف سے یرقان زدہ نظر آ رہا تھا۔ گہرام کے بازو میں اجرک کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ زخم وسان نے گولی کی صورت میں اسے لگایا تھا۔

"اس کو چھوڑ دے کتے۔۔۔ورنہ۔۔۔" وسان قہر آلود لہجے میں دھاڑا اور اپنی رائفل سیدھی کر لی۔

"خبردار۔۔۔گولی چلائی تو۔۔۔یہ شہزادی۔۔۔خون میں نہا جائے گی؟"

گہرام نے سفاک لہجے میں پھنکارتے ہوئے وسان سے کہا۔۔۔اس

بدبخت نے بے چاری نوراں کو۔۔۔اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔۔۔رائفل گھرام کے بائیں ہاتھ میں تھی جس کا رخ وسان کی طرف ہی تھا۔جبکہ دائیں ہاتھ کے شکنجے کو اس نے نوراں کی گردن کے گرد حمائل کر کے اسے اپنے آگے کر رکھا تھا۔

اپنی نازک اندام بیوی کو اپنے بدترین اور ذلیل صفت دشمن کے شکنجے میں اس طرح جکڑے دیکھا تو وسان کی سلگتی ہوئی آنکھوں میں خون اتر آیا۔مگر وہ بے بس تھا۔

"رائفل پھینک دے۔۔۔وسان!" گھرام نے غرا کر کہا۔

وسان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔اس نے بے بسی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے شکست خوردہ انداز میں رائفل ایک طرف پھینک دی۔اس کی رائفل پھینکنے کی دیر تھی کہ گھرام نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کی لبلبی دبا دی۔ گولیوں سمع خراش تڑتڑاہٹ ابھری۔۔۔وسان نے خود کو گولیوں کی اس بوچھاڑ سے بچانے کی کوشش کی۔۔۔مگر۔۔۔چند گولیوں نے اس کے بائیں بازو کو بری طرح چھید ڈالا۔وسان کے حلق سے اذیت بھری چیخ بلند ہوئی تو نوراں اپنے محبوب شوہر کو خون میں لت پت دیکھ کر انتہائی غم و دکھ کے احساس سے چلائی۔وسان کے قدم لڑکھڑائے۔ادھر اپنے شوہر کو گھرام جیسے رذیل کتے کے رحم و کرم پر دیکھ کر نوراں کے اندر پہلی بار اپنی بقاء کیلئے بے دریغ جرأت پیدا ہوئی اور اس نے انتہائی جنونانہ انداز میں اپنی کہنی پوری قوت سے گھرام کے پیٹ میں رسید کر ڈالی۔گھرام کو نوراں سے ایسی جرأت کی توقع نہ تھی۔ایک لمحے کو وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔اس کے بازو کے شکنجے سے جیسے ہی نوراں کی گردن آزاد ہوئی نوراں نے رکوع کے بل جھکے گھرام کو زور سے دھکا دیا۔گھرام چند قدم عقب میں لڑکھڑایا اور پھر ناہموار زمین سے اس کا ایک پاؤں رپٹ گیا۔وہ نیچے گرا۔۔۔رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ادھر وسان نے دانت بھینچ کر اپنے زخمی بازو کی تکلیف پر قابو پایا اور وحشیانہ دہاڑ کے

ساتھ۔۔۔گھرام پر جھپٹا۔گھرام نے سنبھلتے ہی وسان کے زخمی اور خون آلود بازو پر مکہ جڑ دیا۔وسان کیلئے دوسری اذیت ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔۔۔باعث تکلیف بے اختیار چیخا۔گھرام نے اٹھ کر زمین پر گری رائفل کو اچکنے کیلئے دوڑ لگائی۔۔۔وسان جانتا تھا کہ ایک بار اس خونی درندے کے ہاتھ رائفل لگنے کا مطلب اس کی بھیانک موت تھی۔چنانچہ وہ اپنی تکلیف بھلا کر گھرام کے پیچھے لپکا۔نوراں ایک طرف ہراساں ہرنی کی مانند متوحش نگاہوں سے یہ خونی جنگ دیکھ رہی تھی۔

گھرام رائفل اٹھانے کیلئے جیسے ہی جھکا تو وسان بھی اتنی دیر میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا اس نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ ایک زوردار لات رائفل اٹھانے کیلئے جھکے ہوئے گھرام کی پشت پر رسید کر دی۔گھرام زمین پر الٹ گیا۔مگر وہ رائفل پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔وہ پشت کے بل زمین پر لیٹے لیٹے ہی رائفل کا رخ وسان کی طرف کرنے لگا تو وسان اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔۔۔اس کا بایاں بازو گولیوں سے چھلنی تھا۔جو تقریباً ناکارہ ہو چکا تھا۔مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔اس پر وحشیانہ جنون سوار تھا۔جو ہر صورت میں اپنے بدترین دشمن کو جلد سے جلد نابود کرنے کے درپے ہو رہا تھا۔لہٰذا وہ اپنے دائیں ہاتھ کی طاقت کو بروئے کار لاتے ہوئے گھرام کی رائفل چھیننے کیلئے زور آزمائی کرنے لگا اگرچہ گھرام کا ایک بازو بھی زخمی تھا مگر اس کا زخم۔۔۔بہرحال وسان کے زخم سے کم گہرا اور معمولی تھا۔اس لئے وہ تقریباً اپنے دونوں ہی بازوؤں کی طاقت لگانے میں مصروف کار تھا۔دونوں کے چہرے سرخ تھے۔آنکھوں میں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی سفاکی اتری ہوئی تھی۔ پھر ایک موقع پر گھرام نے اپنے چاروں شانے چت وجود کو جھٹکے سے پلٹا۔۔۔اب وہ وسان کے اوپر تھا۔مگر۔۔۔وسان نے اپنے مضروب وجود کی پوری طاقت ایک بازو پر مجتمع کرتے ہوئے رائفل پر گرفت مضبوطی سے جمار کھی اور تب پھر اچانک گھرام نے اپنے سر کی بھرپور ٹکر وسان کی ناک پر ماری۔وسان ایک لمحے کو بلبلا اٹھا۔۔۔رائفل پر

اس کے ہاتھ کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑنے لگی تو گہرام نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے رائفل جھپٹ لی۔ وسان کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ گہرام رائفل پر کامیابی سے اپنا قبضہ جمائے کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا تو۔۔۔اچانک اسے اپنے سر پر قیامت ٹوٹتی محسوس ہوئی۔۔۔۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وسان نے اس کے عقب میں کھڑی نوراں کو دیکھ لیا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ جو وسان ہی کی تھی اور اس نے گہرام کی دھمکی پر پھینکی تھی اور جانے کسی وقت نوراں نے اپنے شوہر کو خطرے میں بھانپ کر اسے اٹھا لیا تھا۔ گہرام کے عقب میں اس نے رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما کر اس کا ٹھوس کندھا ذلیل صفت گہرام کے سر پر دے مارا تھا۔ وسان کیلئے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ اس نے پھر کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگائی ادھر نوراں نے دوبارہ رائفل سے لٹھ کا وار کیا۔ تو گہرام کو اپنے کندھے کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی وہ۔۔۔حلق کے بل چیخا وسان نے لڑکھڑاتے گہرام کے ہاتھ سے رائفل جھپٹ لی۔۔۔ گہرام کو ہوش آیا تو وہ۔۔۔غرا کر نوراں کی طرف جھپٹا۔۔۔مگر وسان نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ گہرام کے حلق سے دلخراش چیخ ابھری اور وہ۔۔۔وہیں نوراں کے قدموں میں گر کر چند ثانیے تڑپنے کے بعد ٹھنڈا پڑ گیا۔ نوراں نے انتہائی نفرت سے اس کے مردہ چہرے پر تھوک دیا وسان نے رائفل پھینک دی۔ نوراں تڑپ کر اس کی طرف بڑھی۔

"سائیں۔۔۔!تت۔۔۔۔تم۔۔۔"

"کچھ نہیں ہوا ہے۔نوراں؟" وسان کے تھکے تھکے سے لہجے میں از حد طمانیت تھی۔

"مم۔۔۔مگر سائیں۔۔۔!تم بہت زخمی ہو۔۔۔۔؟" نوراں پر تشویش لہجے میں بولی۔ تو وسان نے اسے اپنی اجرک اتار کر دی اپنے زخمی بازو کے گرد لپیٹنے کو کہا۔ نوراں نے جلدی جلدی۔۔۔وسان کے خون آلود بازو میں اجرک کی لیریں

پھاڑ کر لپیٹ دیں۔ پھر وسان نوراں کو اپنے دائیں بازو سے قریب کرتے ہوئے عجیب سی طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

"نوراں۔۔۔ظلم کی سیاہ رات تمام ہوئی۔۔۔آؤ۔۔۔سڑک اب زیادہ دور نہیں۔۔۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کے سہارے شہر جانے والی سڑک کی طرف چل دیے۔

☆......ختم شد......☆